نوم چومسکی کے خطبات

(ماحولیاتی بحران)

ترجمہ: اعزاز باقر

نوم چومسکی کے خطبات

(ماحولیاتی بحران)

ترجمہ: اعزاز باقر

مشعل بکس

آر-بی5، سیکنڈ فلور، عوامی کمپلیکس،

عثمان بلاک، نیوگارڈن ٹاؤن، لاہور۔54600، پاکستان۔

نوم چومسکی کے خطبات

(ماحولیاتی بحران)

ترجمہ: اعزاز باقر

کاپی رائٹ اردو © 2021 مشعل بکس

ناشر: مشعل بکس

آر-بی-5، سیکنڈ فلور،

عوامی کمپلیکس، عثمان بلاک، نیوگارڈن ٹاؤن، لاہور-54600، پاکستان۔

فون وفیکس: 042-35866859

Email: mashbks@brain.net.pk

http://www.mashalbooks.org

www.MashalBooks.org

نوم چومسکی کے خطبات

(ماحولیاتی بحران)

www.MashalBooks.org

مندرجات

1- ماحولیاتی تبدیلی کی تحریک کومہمیز کرنا

نوم چومسکی کا ڈان موسِپ ۔ باکول کو انٹرویو
برائیر پیچ میگزین، جولائی/اگست 2009

برائیر پیچ: ماحولیاتی تبدیلی کی تحریک کی رواں صورتحال کے حوالے سے آپ کا کیا کہتے ہیں؟

نوم چومسکی: میرے خیال میں اسے کوئی منظم، مرکزی حیثیت کی حامل تحریک نہیں کہا جا سکتا۔ ایک قسم کا عمومی اتفاق رائے ہے، جس کا اظہار سائنسدانوں کی طرف سے بھی کیا جاتا ہے، یہ کہ مسئلہ انتہائی گمبھیر ہے، اوراگرچہ اس حوالے سے بہت سی خام خیالیاں ظاہر کی جاتی ہیں کہ آئندہ کیا صورتحال ہوگی، تاہم اس امر پر اتفاق پایا جاتا ہے کہ ہم جتنا عرصہ انتظار کرتے رہیں گے، آنے والی نسلوں کا مستقبل اتنا تاریک ہوتا چلا جائے گا۔

صورتحال بعض سنگین قسم کی سماجی واقتصادی اصلاحات کی متقاضی ہے۔ ہمارا طرز زندگی ایک غیر مستحکم خاصیت کا حامل ہو چکا ہے، خاص طور پر مغربی دنیا اور خصوصاً شمالی امریکہ میں۔ آبادی کی چھوٹی چھوٹی اکائیوں میں تقسیم (Atomization) اور بلا جواز قسم کے نظام اصراف اور قرضوں کے بوجھ جیسے عوامل نے بہت سنجیدہ قسم کے سماجی، اقتصادی اور ثقافتی مسائل کو جنم دیا ہے جن پر کہ قابو پانے کی ضرورت ہے۔ لوگوں کو متحد اور منظم کرنے کے لئے کسی طرح کی بنیادی ساختیں موجود نہیں ہیں؛ اب وقت آ گیا ہے کہ یہ ساختیں تعمیر کی جائیں۔ بہت سے لوگ ہیں جو کہ ماحولیاتی معاملات میں دلچسپی رکھتے ہیں مگر ان کے درمیان روابط کا شدید فقدان پایا جاتا ہے۔

شہر کے ایک کونے میں موجود لوگوں کو علم ہی نہیں ہوتا کہ دوسرے کونے میں کیا ہو رہا ہے، اور اس مسئلے کو حل کرنے کی ضرورت ہے۔

برائیر پیچ: ہم ان خلیوں کا کس طرح احاطہ کر سکتے ہیں؟

نوم چومسکی: اس مسئلے کا کوئی جادوئی حل نہیں ہے ماضی میں اس کا حل کیا گیا تھا اور وہ بہت کامیاب رہا ہے۔ تحریک نسواں کیسے پروان چڑھی؟ بہت چھوٹی چھوٹی انجمنوں کی بدولت جنہوں نے اشتراک عمل کیا۔ خواتین کی چھوٹی چھوٹی انجمنوں نے یکجا ہو کر عظیم تبدیلی برپا کر دی۔ یا پھر شہری حقوق کی تحریک نے۔ یا مزدوروں کی تحریک نے۔ یہ یقیناً کئی برسوں پر مُشتمل سخت جدوجہد کی مثالیں ہیں، خاص طور پر امریکہ میں۔

اس کے لئے سخت محنت کرنے کے ساتھ ہی خود کو کسی مقصد کے لئے وقف کر دینے کی ضرورت ہوتی ہے۔

تاہم زیر نظر معاملے میں واقعی کٹھن مراحل سے گذرنا ہوگا کیونکہ لوگوں کو اپنے طرز زندگی میں تبدیلی لانی پڑے گی۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ پہلے سے بدتر طرز زندگی بلکہ ایک مختلف طرز زندگی، ایسا طرز زندگی جس کے آپ عادی نہیں ہیں، اس کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔ دراصل، کئی پہلوؤں سے یہ ایک ایسا طرز زندگی ہے جو موجود تو تھا۔ مگر جسے ہم نے تباہ کر کے رکھ دیا۔

اب ہم اسے دوبارہ کیسے تخلیق کر سکتے ہیں؟ بالکل اسی طرح جیسے ہم نے ماضی میں کیا تھا۔ یہ خود بخود وقوع پذیر نہیں ہو جاتا۔ ہماری تاریخ میں اس کے کچھ نمونے موجود ہیں اور چند ایک ایسے بھی ہیں جو آج عین ہماری آنکھوں کے سامنے موجود ہیں۔ لاطینی امریکہ دنیا میں انتہائی ہیجان خیز قسم کا خطّہ ہے؛ وہاں مقبول عوامی تحریکوں کی بنیاد پر اہم تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں۔ بولیویا کی مثال ہی لے لیں جو کہ لاطینی امریکہ کا غریب ترین مُلک ہے۔ اگر اس ملک میں غریب کسان منظّم ہو کر سیاسی نظام پر تسلط حاصل کر سکتے ہیں تو پھر یہ کہنا مضحکہ خیز ہوگا کہ ہم ایسا نہیں سکتے۔ انہوں نے یہ کر دکھایا۔ مگر ہم ایسا نہیں کر رہے اور یہی ہمارا مسئلہ ہے۔

برائیر پیچ: تو پھر وہ کیا چیز ہے جو ہمیں ایسا کرنے سے روک رہی ہے؟

www.MashalBooks.org

نوم چومسکی: جو امر ہماری راہ میں مانع ہے وہ گذشتہ صدی میں معاشروں کو چھوٹی چھوٹی اکائیوں میں تقسیم کر دینے اور انہیں ایسی مصنوعی و سطحی قسم کی چیزوں کی طرف مائل کر دینے کی شدید کاوشیں ہیں، جیسے اصراف۔ آپ کو صارفین کا طبقہ پیدا کرنا ہوتا ہے۔ آپ کو لوگوں کے دلوں میں حکومت کے لئے نفرت پیدا کرنی ہوتی ہے۔ جس ذہنیت کو فروغ دے دیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ ایک ایسی بیگانہ قسم کی طاقت موجود ہے جسے ''حکومت'' کہا جاتا ہے اور جو آپ کی محنت کی کمائی کو چرائے جا رہی ہے۔

بڑے بڑے کاروباری ادارے، اپنی باتوں کے باوجود، ایک طاقتور ریاست کے خواہاں ہوتے ہیں جو معیشت میں اور ان کی اپنی دنیا میں فیصلہ کن قسم کی مداخلت کر سکے، مگر ان کاروباری اداروں کے مفاد میں نہ کہ عوامی مفاد میں۔ وہ چاہتے ہیں کہ آپ حکومت سے نفرت کریں کیونکہ حکومت کے کچھ شعبے جو عوام کی ضرورت ہوتے ہیں لوگوں کے فائدے کے لئے اپنی جگہ موجود ہوتے ہیں۔ میرے خیال میں لوگوں کو اس کا لاشعوری قسم کا فہم ہوتا ہے، کیونکہ اسی طرح سے ہی آپ کو پتہ چلتا ہے کہ 80 فی صد لوگوں کا یقین یہ ہے کہ مُلک ''اپنے مفاد کو سامنے رکھنے والے چند بڑے اداروں'' کی طرف سے چلایا جا رہا ہے۔

تاہم علیحدگی اور ٹوٹ پھوٹ اس قدر ہو چکی ہے کہ لوگوں کو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ اس حوالے سے کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ دراصل چند ایک اعداد و شمار تو چونکا کر رکھ دینے والے ہیں: ایک تہائی لوگوں کی سوچ یہ ہے کہ یہ بُش انتظامیہ ہی تھی جس نے ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر حملہ کروایا تھا اور اس نظریے کو سچا ثابت کرنے کے لئے ایک پوری تحریک چلائی جا رہی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ آبادی کے ایک وسیع طبقے کی سوچ مرنے مارنے پر تلا قاتلوں کا ایک ایسا جتھہ ہے جو انہیں مرنے مارنے پر تلا ہوا ہے اور وہ اس جتھے کے سامنے بے بس ہیں۔

آپ انہیں مایوسی کی انتہاء میں گھرے ہوئے نہیں کہہ سکتے۔ یہ ایسے ہے کہ جیسے آپ کسی غلام ریاست میں رہ رہے ہوں اور اپنے اس مالک سے نفرت کرتے ہوں جو آپ کے ساتھ ہر طرح کی گھناؤنی حرکات کرتا ہے مگر آپ اس کے آگے بے بس ہوں۔ یہ ایک بہت عام سا احساس

ہے اور اسے بڑے پیمانے پر تشہیر کر کے لوگوں کے ذہنوں میں داخل کیا جا رہا ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد، مثال کے طور، ساری دنیا میں روایت شکن جمہوریت کی ایک لہر چل پڑی تھی۔ لوگ دنیا کو واقعی تبدیل شدہ اور زیادہ جمہوری حالت میں دیکھنا چاہتے تھے۔ یہ کساد بازاری اور جنگ کے نتیجے میں پیدا ہونے والا احساس تھا؛ ان دونوں عوامل نے لوگوں کو سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس کے بعد تعلقات عامہ پر اثر انداز ہونے کے لئے ایک ایسی عظیم الشان مہم چلائی گئی جس کا مقصد لوگوں کے ذہنوں سے اس سوچ کو نکالنا تھا؛ ایسی غیر معمولی کوششیں جن پر کافی تحقیق کی جا چکی ہے۔ اس کا ایک مقصد لوگوں کے دلوں میں حکومت کے خلاف نفرت پیدا کرنا بھی تھا۔

1954 میں دو ایسی فلمیں تھیں جو منظر عام پر آئیں۔ ایک تو وہ مشہور زمانہ فلم جس کا عنوان تھا ''آن دا واٹر فرنٹ''۔ یہ اس عام سے، ایماندار آدمی کے بارے میں تھی جس کا کردار مارلن برانڈو نے ادا کیا تھا جو کہ یونین کے بدعنوان عہدیداروں کے خلاف ڈٹ گیا تھا۔ فلم کے اختتام میں وہ یونین کے بدعنوان رہنما کو پانی میں پھینک دیتا ہے۔ ہر ایک خوشی سے نعرہ لگاتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ یہ فلم محنت کشوں کے لئے مگر مزدور تنظیموں کے خلاف ہے۔ یہ بہت اہم پہلو ہے۔ اگر آپ ری پبلکن پارٹی کی تشہیری مُہم پر نظر ڈالیں تو وہ بُش کو محنت کش طبقے کے آدمی کے طور پر پیش کرتی ہیں۔ وہ ایک ایسا شخص ہے جو شراب خانے کے گرد منڈلاتا رہتا تھا اور اسے محنت کشوں کے حامی کے طور پر اجاگر کیا جاتا ہے۔

اسی برس ایک اور فلم بھی بنائی گئی تھی، جو کہ ہر لحاظ سے بہت بہتر تھی، اور اس کا عنوان تھا ''سالٹ آف دا ارتھ'' یہ کانوں کے اندر ہونے والی ان ہڑتالوں کے بارے میں تھی جن کی قیادت محنت کشوں کے ہاتھ میں تھی۔ یہ ایک بہت متاثر کُن فلم تھی۔ بہت خوب، آپ کو معلوم ہے کہ کون سی زیادہ مقبول تھی۔ یہ ہے وہ روایتی انداز جس کے تحت بڑی باریک بینی سے کی گئی تشہیر فائدہ مند رہتی ہے۔

برائیر پیچ: لوگ اس حصار سے کس طرح باہر نکلتے ہیں؟

نوم چومسکی: حقیقت تو یہ ہے کہ انفرادی طور پر بہت سے لوگ نکل چکے ہیں۔ مگر سماجی سرگرمی کو اس

www.MashalBooks.org

فہم کے ساتھ یکجا کر دیا گیا ہے کہ یہ صرف میں ہوں؛ میں اکیلا کچھ نہیں کرسکتا۔

ان ایّام کی طرف واپس لوٹتے ہیں جب تنظیموں اور تحریکوں کی تعمیر بالکل شروع سے کرنی پڑتی تھی۔ ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ کوئی عظیم الشان قائد موجود ہو جو منظر عام پر نمودار ہوتا ہے اور کہتا ہے کہ ''میں آپ کو مصائب کے اس چنگل سے نکالنے والا ہوں۔'' اس طرح کی چیزیں شعور میں اضافہ کرنے والی تنظیموں کی بدولت تشکیل پاتی ہیں۔ 1960 کی دہائی کی جنگ مخالف تحریک بھی اسی طرح وجود میں آئی تھی: آخر کار یہ اپنے نقطۂ انتہا پر پہنچ گئی اور یوں بڑے پیمانے کی عوامی تنظیمیں وجود میں آ گئیں۔ کینیڈا میں صحت کی دیکھ بھال کا نظام کیوں پایا جاتا ہے؟ یہ لوگوں کو تحفے میں نہیں ملا تھا؛ یہ تنظیمی تحریکوں کا نتیجہ تھا۔

برائیر پیچ: تو پھر ہمیں اگلے مرحلے/درجے تک پہنچنے کے لئے کن اقدامات کی ضرورت ہے؟

نوم چومسکی: میرے خیال میں جگہ جگہ چھوٹے پیمانے کی کاوشیں بھی بہتر رہیں گی مگر ان کے درمیان ہم آہنگی درکار ہوگی۔

ایک بار پھر جنگ مخالف تحریک کی مثال لیتے ہیں۔ جب میں نے 1960 کے عشرے کے شروع میں اظہارِ خیال کی منظم کاوشوں کا آغاز کیا تھا تو اس وقت میں لوگوں کی چھوٹی چھوٹی انجمنوں سے مخاطب ہوتا تھا، کسی شخص کے گھر کی بیٹھک میں یا شاید کسی چرچ کے تہہ خانے میں۔ یا پھر ہمیں کسی یونیورسٹی میں 20 مختلف موضوعات کے ساتھ اجلاس منعقد کرنا پڑتا تا کہ لوگ ویت نام کی جنگ کے حوالے سے ہمارے خیالات سُننے آ جائیں۔

یہ ایک ایسی چیز ہے جو کسی اسکول میں نہیں پڑھائی جاتی، نہ ہی کسی مقالے کی صورت میں لکھ کر پیش کی جاتی ہے: یہ بہت ہی خطرناک صورت ہوگی۔ لوگوں کو اس امر کا پیشگی شعور نہیں ہوتا کہ وہ متحد ہو کر کیا کچھ حاصل کر سکتے ہیں۔

برائیر پیچ: کیا ماحولیاتی تبدیلی کے حوالے سے تحریک اسی درجے پر پہنچ سکتی ہے جس درجے پر وہ تمام تحریکیں پہنچ گئی تھیں جن کا آپ نے ذکر کیا ہے؟

نوم چومسکی: یہ ایک بڑے پیمانے کی تحریک ہو سکتی تھی مگر ایسا خود بخود نہیں ہو جاتا۔ جب سیاہ فام

بچوں کا ایک گروہ دوپہر کے کھانے کی میز پر بیٹھا تھا تو آپ اندازہ نہیں لگا سکتے تھے کہ آگے کیا ہونے والا تھا، مگر چند ہی برسوں میں ایک بڑے پیمانے کی مقبول تحریک وجود میں آ گئی۔ یا پھر حقوقِ نسواں کی تحریک کو ہی دیکھ لیں: محض چند ایک آگاہی مُہم چلانے والی انجمنیں، اور جلد ہی وسیع پیمانے پر عوامی تحریک وجود میں آ گئی۔

ماحولیاتی تبدیلی کی تحریک اس لحاظ سے مختلف ہے کہ ہمیں اس حوالے سے کسی کو بھی کسی فلسفے کا قائل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ لوگ پہلے سے متفق ہیں۔ جبکہ دوسری تحریکوں میں ہمیں لوگوں کو اس امر پر قائل کرنا پڑتا تھا کہ ان کے خیالات غلط تھے، ان کی وابستگیاں غلط تھیں، ان کا طرزِ حیات غلط تھا۔ تاہم یہاں پر میرا خیال یہ ہے کہ ایک عمومی اتفاق رائے پہلے سے ہی موجود ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ وال اسٹریٹ جرنل کے ادارتی ماہرین کی ٹیم کے چناؤ کے حوالے سے اتفاق نہ کریں، مگر کسے پرواہ ہوگی؟

مُشکل مرحلہ ہمیشہ یہی ہوتا ہے کہ افراد اور چھوٹی انجمنوں کے درمیان ہم آہنگی سے آگے بڑھ کر اتحاد اور مرتکز عمل کی سمت پیش قدمی کی جائے۔ اس کے لئے کاوِش اور وابستگی کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایسا خود کار طریقے سے نہیں ہو جاتا؛ اس کے لئے ہدایت نامے موجود ہیں۔

برائیر پیچ: تو یہاں اُمید کی کرن کہاں سے آتی ہے؟

نوم چومسکی: مجھے اس طرح سے وضاحت کرنے دیں۔ آپ کے پاس بنیادی طور پر دو راستے ہیں: یا تو آپ اُمید ترک کر دیں، مایوسی کا شکار ہو جائیں اور یوں اس امر کا یقین کر لیں کہ صورتحال بدترین ہونے لگی ہے، یا پھر آپ پُر اُمید رہیں، اور پھر اس اُمید کو حقیقت کا روپ دینے کی کوشش کریں۔ یوں اس امر کا امکان پیدا ہو جائے گا کہ بہتری ہو جائے گی۔

ان راستوں کے پیشِ نظر اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ آپ یقیناً پُر امید ہیں۔

ماخذ:

https://chomsky.info/200907

www.MashalBooks.org

2- عالمی حِدّت اور انسانیت کا مستقبل

سی۔ جے۔ پولی کرونیو کی طرف سے نوم چومسکی اور
گریسیلا چچلنسکی کا انٹرویو، 17 ستمبر، 2016

سی۔ جے۔ پولی کرونیو: سائنسدانوں اور حتیٰ کہ سیاسی اور سماجی تجزیہ کاروں کے مابین بھی اس حوالے سے اتفاق رائے اجاگر ہوتا نظر آتا ہے کہ عالمی حدّت اور موسمیاتی تبدیلی کرۂ ارض کے لئے عظیم ترین خطرے کی علامت بن چکے ہیں۔ کیا آپ اس سے اتفاق کرتے ہیں، اور کیوں؟

نوم چومسکی: مجھے ان ماہرین کے اخذ کردہ نتائج سے اتفاق ہے جو ایٹمی سائنسدانوں کے تیار کردہ بیان کے لئے یوم حشر کی ساعت کا تعین کرتے ہیں۔ انہوں نے ساعت کو نصف شب سے دو منٹ قریب کر دیا ہے، نصف شب ہونے میں تین منٹ رہ گئے ہیں، ایٹمی جنگ اور عالمی حدّت کے بڑھتے خطرات کی بدولت۔ یہ میرے خیال میں ایک قابل اعتبار رائے ہے۔ گذشتہ واقعات کے جائزے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ تقریباً ایک معجزہ ہی ہے کہ ہم ایٹمی دور کے خطرات سے بچ گئے ہیں۔ اس طرح کی متواتر مثالیں ملتی ہیں جب ہم ایٹمی جنگ کے دہانے پر پہنچ چکے تھے، اکثر و بیشتر پیشگی انتباہ کرنے والے نظاموں کی خرابی اور دیگر حادثات کی بدولت، بعض اوقات سیاسی رہنماؤں کے بڑے پیمانے پر تشہیر کردہ افعال (کے نتیجے میں) پیدا کردہ۔ کچھ عرصے سے یہ معلوم ہوتا چلا آ رہا ہے کہ ایٹمی جنگ کا نتیجہ شدّت کی سردی اور تاریکی کی صورت میں بھی برآمد ہو سکتا ہے جو حملہ آوروں اور اہداف دونوں کے لئے تباہ کن ہو گی۔ اور خطرات میں اب اور بھی اضافہ ہو رہا ہے۔ خاص طور پر روسی سرحدوں پر، جارج کرنین اور دیگر معروف شخصیات کی اس پیش گوئی کی

تصدیق کرتے ہوئے کہ نیٹو کے دائرہ کار میں توسیع، خاص طور پر جس طرح سے یہ عمل میں لائی گئی، ایک ''المناک غلطی''، ''تاریخی اہمیت کی حامل حکمت عملی کی غلطی'' ثابت ہو گی۔

جہاں تک موسمیاتی تبدیلی کا تعلق ہے، اب سائنسی طبقے کی طرف سے اس امر کا وسیع طور پر اعتراف کیا جا چکا ہے کہ ہم اب ایک نئے ارضیاتی دور میں داخل ہو چکے ہیں، انیتھرو پوسین (انسانی سرگرمی میں اضافے کی بدولت ماحول کی آلودگی کا) دور، جس میں کہ انسانی سرگرمیوں کی بدولت کرّہ ارض کا موسم / آب و ہوا فیصلہ کن طور پر تبدیل ہوتی جا رہی ہے، اسے مختلف قسم کے سیارے میں تبدیل کرتے ہوئے، ایک ایسا سیارہ جو ہو سکتا ہے کہ اس قابل ہی نہ رہے کہ انسانی زندگی کو کسی ایسی منظم شکل میں برقرار رکھ سکے جسے ہم برداشت کرنا پسند کر لیں۔ اس امر پر یقین کرنے کا مناسب جواز پایا جاتا ہے کہ ہم پہلے ہی ''چھٹی فنا'' کے مرحلے میں داخل ہو چکے ہیں، بڑے پیمانے پر انواع کی تباہی کا ایسا دور جس کا موازنہ ساڑھے چھ کروڑ برس قبل کی اس ''پانچویں فنا'' سے کیا جا سکتا ہے، جب زمین پر تقریباً تین چوتھائی انواع معدوم ہو کر رہ گئی تھیں بظاہر کسی عظیم الشان سیارے کی ٹکر سے۔ فضا میں کاربن ڈائی آکسائیڈ (CO_2) کی مقدار میں اتنی تیزی سے اضافہ ہو برسوں میں کوئی ارضیاتی نظیر نہیں ملتی۔ فکر کی بات یہ ہے، جیسا کہ 150 ممتاز سائنسدانوں کا بیان ہے، کہ ''عالمی حدّت کا عمل، جس کی شدّت میں قطبی علاقے میں پگھلتی ہوئی برف، مستقل منجمد رہنے والے علاقوں (Permafrort) سے نکلتی ہوئی میتھین گیس، اور وسیع پیمانے پر آگ لگنے جیسے واقعات سے مزید اضافے کی نشاندہی ہوتی ہے، نا قابل واپسی ہو سکتا ہے،'' جس کے زمین پر تباہ کن اثرات ہو سکتے ہیں، بشمول انسانوں کے لئے، اور وہ بھی مستقل قریب میں سطح سمندر میں اضافہ اور برفانی تودوں کے پگھلاؤ سے پانی کے ذخائر میں ہونے والی تباہی ایسے عوامل ہیں جو انسانوں کے لئے تباہ کن ثابت ہونے کے لئے کافی ہیں۔

گریسیلا چچلنسکی: اس امر پر اتفاق رائے پایا جاتا ہے کہ موسمیاتی تبدیلی (کے اثرات) ایٹمی جنگ کے ہمراہ بلند درجے کے دو ایسے خطرات کی ذیل میں آجاتے ہیں جو اس وقت تہذیب انسانی کو درپیش ہیں۔ اگر ایٹمی جنگ کے اثرات کے حوالے سے یہ یقین کیا جاتا ہے کہ انہیں محدود

www.MashalBooks.org

رکھا جا سکتا ہے تو پھر موسمیاتی تبدیلی عظیم ترین خطرے کی حیثیت اختیار کر جاتی ہے۔

اگرچہ ایٹمی جنگ کے خطرے کو حذف کر دینا بہت مُشکل نظر آتا ہے، تاہم اس کے لئے عالمی معیشت میں اس سے کہیں کم تبدیلیاں درکار ہیں جتنی کہ موسمیاتی تبدیلی سے بچنے یا اس کے عمل کو واپس پھیرنے کے لئے درکار ہوں گی۔ موسمیاتی تبدیلی کے پس پردہ صنعتی ترقی کے لئے استعمال ہونے والی توانائی کا عنصر کارفرما ہے جس کی بنیاد غالب طور پر قدرتی ایندھن کے ذخائر (Fossil Fuels) پر ہی رہی ہے اور ابھی تک ہے۔ ایک ایسے اقتصادی نظام کو تبدیل کرنا جو ناقابل گرفت اور ناقص طور پر پیمائش کردہ اقتصادی افزائش کا مقصد حاصل کرنے پر تلا ہوا ہو اور جس کا دارومدار زیادہ تر قدرتی توانائی پر ہو، اس سے بہت زیادہ مشکل ہے جتنا کہ اس طریقے کو جس کی بدولت ایٹمی توانائی کو جنگلی مقاصد کے لئے بروئے کار لایا جاتا ہے۔ بعض کے نزدیک ایسا کرنا ناممکن ہے۔

قریب قریب ساری سائنسی تحقیقات اس امر کی نشاندہی کرتی ہیں کہ درجہ حرارت میں 1925 سے اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے، اور نیویارک ٹائمز میں شائع ہونے والے ایک حالیہ مضمون میں اس امر کی تصدیق کی گئی ہے کہ کئی عشروں سے سائنسدانوں کی طرف سے عالمی حدّت کے حوالے سے جاری کئے جانے والے تنبیہی بیانات کو اب کسی طور بھی محض نظریہ قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ سطح ارض پر برف پگھل رہی ہے اور سطح سمندر میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اس کے باوجود ابھی تک ایسے لوگ موجود ہیں جو نہ صرف وسیع طور پر تسلیم کردہ اس سائنسی نظریئے کے حوالے سے شک و شبے کا اظہار کرتے ہیں کہ موجودہ موسمیاتی تبدیلی زیادہ تر انسانی سرگرمیوں کا نتیجہ ہے بلکہ سطح زمین کے درجہ حرارت کے مستند ہونے کا بھی یقین نہیں رکھتے۔ کیا آپ کے خیال میں اس کے پس پردہ کوئی سیاسی محرک کارفرما ہے یا لاعلمی اور شاید تبدیلی کے خوف کا عنصر بھی؟

چومسکی: یہ موجودہ دور کی ایک حیرت انگیز حقیقت ہے کہ دنیا کی تاریخ میں ایک انتہائی طاقتور ملک میں جہاں بلند درجے کی تعلیم و مراعات حاصل ہیں، دو میں سے ایک سیاسی جماعت انسانی سرگرمی کے نتیجے میں پیدا ہونے والی موسمیاتی تبدیلی کے حوالے سے مصدقہ حقائق کی عملاً" نفی کرتی نظر

آتی ہے۔ 2016 کے انتخابات کے لئے ہونے والے بنیادی مباحثے میں ری پبلکن پارٹی کا ہر اُمیدوار موسمیاتی تبدیلی سے انکاری تھا، ماسوائے ''معمولی طور پر اعتدال پسند'' جان کاسچ کے، جس کا کہنا تھا کہ ہو سکتا ہے ایسا ہو رہا ہو مگر ہمیں اس حوالے سے کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہے ذرائع ابلاغ میں بھی اس مسئلے کی شدت کو طویل عرصہ تک نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔ امریکہ میں قدرتی ایندھن کی پیداوار، توانائی کی خود انحصاری وغیرہ کے حوالے سے خوش افزا قسم کی خبروں میں اس حقیقت کا شاذ و نادر ہی تذکرہ کیا جاتا ہے کہ اس طرح کے فاتحانہ دعوے تباہی کی رفتار کو تیز تر کر دیتے ہیں۔ بہت سے اور عوامل بھی ہیں، مگر ان حالات میں یہ بمشکل ہی حیرت انگیز لگتا ہے کہ آبادی کی خاطر خواہ اکثریت یا تو انکار کرنے والوں کے ساتھ ہے یا پھر مسئلے کو اتنا اہم نہیں گردانتی۔

چچلنسکی: موسمیاتی تبدیلی نئی اور پیچیدہ قسم کی ہے۔ ہمارے پاس تمام سوالوں کے جواب نہیں ہیں۔ ہم ابھی تک یہ معلوم کر رہے ہیں کہ زمین کاربن ڈائی اکسائیڈ حدّت کا باعث بننے والی دوسری گیسوں کی بڑھتی ہوئی مقدار پر عین کیا ردّعمل کرتی ہے۔ ہمیں علم ہے کہ اس کا نتیجہ سمندروں کے گرم ہونے کی صورت میں برآمد ہوتا ہے جو قطب شمالی اور قطب جنوبی کی برفوں کو پگھلا رہے ہیں، امریکہ میں اور دیگر جگہوں پر سارے کے سارے ساحلی علاقوں کو غرقاب کر رہے ہیں، جیسا کہ نیویارک ٹائمز کے مضمون میں باقاعدہ نشاندہی کی گئی ہے۔ ہمیں علم ہے کہ گرم ہوتے ہوئے سمندروں کی سطح میں اضافہ جزائر پر آباد تمام اقوام کو غرقاب کر دے گا جو کہ اقوام متحدہ کے رائے دھندگان کا 25 فی صد ہیں، اور شاید آخرکار ہماری تہذیب کو ہی نیست و نابود کر کے رکھ دے گا۔ یہ آگہی بہت تکلیف دہ ہے اور تکلیف یا صدمے کا پہلا ردّعمل حقیقت سے انکار ہوتا ہے۔ چونکہ ابھی چند ایک سائنسی شبہات اپنی جگہ برقرار ہیں، اس لئے ایک فطری ردّعمل وقوع پذیر تبدیلی سے انکار کرنا ہے۔ یہ قدرتی سی بات ہے مگر بہت خطرناک۔ گھر میں لگی ہوئی ایسی آگ جس کی نوعیت کا پوری طرح احاطہ نہ کیا جا رہا ہو مگر جس پر قابو پانا ممکن ہو، عملی اقدامات کی متقاضی ہوتی ہے نہ کہ بے عملی کی۔ اگرچہ حقیقت سے فرار کا نتیجہ یقین کی صورت میں نکلتا ہے مگر یہ صرف موت کا یقین ہوگا۔

www.MashalBooks.org

یہی کچھ افراد اور تہذیبوں کے حوالے سے بھی درست ہے۔

سیاسی جماعتیں تبدیلی کے لمحے میں انکار اور خوف جیسے عوامل سے فائدہ اُٹھاتی ہیں۔ یہ واضح طور پر ادراک کردہ صورتحال ہے جس کا نتیجہ اکثر و بیشتر قربانی کے بکرے والے فلسفے کے اطلاق کی صورت میں برآمد ہوتا ہے: بیرونی عناصر کو الزام دینا، جیسے تارکین وطن، یا نسلی و مذہبی اقلیتیں۔ یہی صورتحال بریگزٹ اور امریکہ و یورپی یونین کے اندر سیاسی گردشوں (سیاسی مفاد کے لئے معیشت میں عارضی اصلاحات) میں تشدد کے عنصر کے پس پردہ کارفرما ہوتی ہے۔ انکار کے بعد غُصے اور پھر آخر میں قبولیت کا مظاہرہ کیا جاتا ہے۔ میرے خیال میں بعض لوگ ابھی تک انکار اور غصے کے درمیان کی حالت میں ہیں، اور اُمید ہے کہ آخرکار حقیقت کو تسلیم کرلیں گے، کیونکہ ابھی بھی وقت ہے کہ عملی اقدامات کئے جائیں، تاہم دروازہ تیزی سے بند ہو رہا ہے۔

عالمی جائزوں کے مطابق موسمیاتی تبدیلی کے حوالے سے امریکی لوگ دنیا کے دیگر لوگوں کے مقابلے میں زیادہ شکوک وشبہات کا شکار ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟ اور اس سے امریکی سیاسی روایات کی کس طرح عکاسی ہوتی ہے؟

چومسکی: امریکہ، غیر معمولی حد تک، ایک ایسا معاشرہ ہے جہاں کاروباری سرگرمیوں کو فوقیت حاصل ہے، اور یوں منافع اور منڈی میں قدم جمانے جیسے تفکرات معقول قسم کی منصوبہ بندی پر حاوی آجاتے ہیں۔ اسی طرح امریکہ میں وسیع پیمانے پر مذہبی بنیاد پرستی کا ماحول بھی غیر معمولی طور پر نمایاں ہے۔ دنیا کے فہم پر ان عوامل کے اثرات بھی غیر معمولی ہیں ایک قومی سطح کے جائزے کے دوران تقریباً نصف رائے دھندگان نے اس یقین کا اظہار کیا کہ خدا نے انسان کو اپنی موجودہ شکل میں لگ بھگ دس ہزار برس قبل پیدا کیا تھا اور یہ کہ انسان کے اجداد کا بندر (Ape) کے اجداد سے کوئی رشتہ نہیں ہے۔ اسی طرح کے عقائد کا اظہار حضرت عیسیٰؑ کے دوبارہ آمد کے حوالے سے کیا جاتا ہے۔ سینیٹر جیمز انہوف، جو کہ سینیٹ کمیٹی برائے ماحولیات کا سربراہ رہا ہے، اس وقت بہت سے لوگوں کی نمائندگی کرتا ہے جب وہ کہتا ہے کہ ''خدا ابھی بھی سب کچھ دیکھ رہا ہے اور جو کچھ ہو رہا ہے وہ بلاسبب نہیں ہو رہا،'' لہٰذا انسانوں کی طرف سے مداخلت مذہبی

احکامات کی خلاف ورزی ہوگی۔

چیلنسکی: ''کرسکتا ہے'' کی منطق، اپنی نوعیت کے لحاظ سے کسی بھی حدود کی قائل نہیں ہوتی۔ اور کسی بھی سلطنت کے پاس اس طرح کے کردار سے بتدریج درگذر کرنے کا کوئی باوقار راستہ نہیں ہوتا۔ تاریخ بار بار یہی کچھ ثابت کرتی نظر آتی ہے۔ امریکہ کی خصوصی حیثیت برقرار رکھنے کی کوشش اس ملک میں تبدیلی کو اذیت ناک عمل بنا کر رکھ دیتی ہے۔

اذیت یا صدمے کی حالت میں پہلا ردّعمل حقیقت سے فرار یا انکار کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے، جیسا کہ میں وضاحت کرچکا ہوں، اس کے بعد غصّے اور پھر آخر میں تسلیم کرنے کی صورت میں۔ میرے خیال میں امریکہ ابھی تک انکار اور غصّے کے درمیان کے مراحل میں ہے، اور مجھے اُمید ہے کہ ہم آخر قبولیت کے مرحلے تک پہنچ جائیں گے، کیونکہ تقریباً گمراہ کن طور پر، عین اس وقت، صرف امریکہ کے پاس ہی وہ ٹیکنالوجی پائی جاتی ہے جو عالمی اقتصادی نظام میں تبدیلی کے لئے درکار ہے۔

حدّت میں کمی لانے والی گیسوں کے عالمی اخراج سے متعلق حالیہ اعداد وشمار سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہم اخراج میں مسلسل اضافے کے دور کو بہت پیچھے چھوڑ سکتے تھے۔ کیا مستقبل میں ماحول کی بہتری کے حوالے سے کسی قسم کی اُمید افزا صورتحال کی گنجائش موجود ہے؟

چومسکی: گرامسی کے ''ارادے کی اُمید افزائی'' کے پیش نظر گنجائش ہمیشہ موجود ہوتی ہے۔ ہمارے سامنے ابھی بھی بہت سے راستے ہیں، مگر انتخاب کی گنجائش کم ہوتی جارہی ہے۔ ترجیحات کا سلسلہ سادہ قسم کے ایسے اقدامات سے لے کر جنہیں موسم سے مطابقت کے حامل گھروں کی تعمیر کی طرح باآسانی اپنایا جاسکتا ہے (اور جن کے نتیجے میں بہت سے ملازمتیں بھی پیدا ہوسکتی ہیں)، توانائی کی بالکل ہی نئی شکلوں، شاید مختلف اجزا کے اتصال، شاید زمین کے کُرّہ فضائی سے باہر شمسی توانائی سے استفادے کے نئے وسائل (جن کی بڑی سنجیدگی سے تجویز دی گئی ہے)، اور کاربن کی سطح میں کمی کے ایسے طریقوں تک پھیلتا چلا جاتا ہے، جو، ایک تصور کے مطابق، زمین کو پہلے سے ہی پہنچے ہوئے نقصانات کی بھی تلافی کرسکتے ہیں۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت کچھ کیا جاسکتا ہے۔

www.MashalBooks.org

چپلنسکی: یہ اچھی خبر ہے، یہ درست سمت میں اٹھایا جانے والا قدم ہے۔ تاہم سڑک میلوں لمبی ہے، اور پہلا قدم، گرچہ ضروری سہی، کامیابی کے حوالے سے فیصلہ کن نہیں ہے۔ یہ ابھی خاطر خواہ ہونے سے بہت دور ہے۔ مسئلہ، جس کا ابھی بہت کم لوگوں کو ادراک ہے، اور جس کو ابھی حال ہی میں آئی پی سی سی (Intergovernment Panel on Climate Change) کے اعداد و شمار میں زیر غور لایا گیا تھا، یہ ہے کہ کاربن ڈائی آکسائیڈ جب ایک مرتبہ خارج ہو جاتی ہے تو پھر کئی سو برس کرّہ فضائی میں ٹھہری رہتی ہے۔ یہ اس طرح گل سڑ نہیں جاتی جس طرح ذرات یا سلفر ڈائی آکسائیڈ گل جاتی ہے۔ ہم نے اپنے کاربن بجٹ کا کثیر حِصّہ صرف کر دیا ہے اور ہم پہلے ہی کاربن ڈائی آکسائیڈ کے ارتکاز کی خطرناک سطحوں تک پہنچ چکے ہیں جو کہ تقریباً 400 پارٹس فی ملین ہے۔

صنعتی دور سے قبل یہ سطح 250 فی ملین تھی۔ چنانچہ مسئلہ ہماری ماضی کی غلط کاریوں کا ہے جن کے روک تھام ضروری ہے۔

آئی پی سی سی کی پانچویں تشخیصی رپورٹ (Fifth Assessment Report) کے صفحہ 19 کے مطابق، بہت سی صورتوں میں ہمیں یہ کرنا ہے خارج کردہ کاربن ڈائی آکسائیڈ کو فضا سے نکالنا پڑے گا۔ یہ اخراج ماضی قریب کے واقعات ہیں، زیادہ تر جنگ عظیم دوم، 1945 کے زمانے سے جو کہ عالمی معیشت کے لئے فیصلہ کن دور تھا۔ یہ امریکی تسلط کا اور اس عالمگیریت کا زمانہ تھا جس کی بنیاد غریب اقوام کے قدرتی وسائل کا ضرورت سے زیادہ حصول کر کے امیر اقوام کی طرف سے ان کا ضرورت سے زیادہ تصرّف کرنے کی حکمت عملی پر رکھی گئی تھی۔ یہ بہت کم لوگوں کی دولت میں تیزی سے اضافے اور مجموعی طور پر عالمی معیشت میں اس سے بھی زیادہ تیزی سے ادر یادگار عدم مساوات اور غربت کے ظہور کا دور تھا۔ یہ امیر (North) مما لک، جہاں کہ دنیا کی صرف اٹھارہ فیصد آبادی رہائش پذیر ہے اور غریب (South) مما لک، جہاں دنیا کے 80 فی صد سے زائد افراد بستے ہیں، کے درمیان تقسیم کی عکاسی کرتی ہے۔

اس حقیقت کے پیش نظر کہ انسانی رویوں میں تبدیلی بہت آہستہ آتی ہے اور یہ کہ عالمی

معیشت میں نئی صاف تر توانائی کے استعمال کی طرف تبدیلی میں کئی عشرے لگ جائیں گے، کیا ہمیں ماحولیاتی تبدیلی کے مسائل کے حل کے حوالے سے ٹیکنالوجی پر مبنی حل دریافت کرنے کی کوشش کرنی چاہیے؟

چومسکی: کسی بھی قسم کے عملی اور امکانی طور پر موثر حل کی کھوج کا سلسلہ جاری رہنا چاہیے۔ اس امر میں شک کی بہت کم گنجائش ہے کہ کسی بھی قسم کے سنجیدہ حل کے ایک بڑے تناسب کے لئے ترقی یافتہ قسم کی ٹیکنالوجی درکار ہوگی، تاہم وہ بھی مکمل حل نہیں ہوگی۔ اس کے علاوہ اور اہم تبدیلیاں بھی درکار ہوں گی۔ گوشت کی صنعتی پیداوار عالمی حدّت میں خاطر خواہ حصہ ڈالتی ہے۔ سارا کا سارا سماجی و اقتصادی نظام منافع کے لئے پیداوار اور ترقی کے ایسے ناگزیر عوامل پر مبنی ہے جو زیادہ عرصہ نہیں چل سکتے۔

قدر (Value) کے حوالے سے بھی بنیادی اختلافات اپنی جگہ موجود ہیں: ایک عمدہ و معیاری زندگی کیا ہوتی ہے؟ کیا مالک اور ملازم کے تعلق جیسی صورتحال جاری رہنی چاہیے؟ کیا ہمارا ہدف واقعی اشیا کی زیادہ سے زیادہ پیداوار ہونا چاہیے، ویبلن کا ''واضح تصرّف (Conspicuous Consumption)'' کا نظریہ (اشیا و خدمات کی بلا ضرورت خرید)؟ یقیناً بلند تر اور زیادہ تسکین دہ قسم کے عزائم سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

چپلنسکی: بظاہر ہمارے پاس کوئی متبادل نہیں ہے۔ میں یہ کہنا چاہوں گی کہ مسئلے کو ماحول دوست توانائی کے وسائل کی بدولت حل کیا جا سکتا تھا۔ تاہم اب انکی بدولت حل کا وقت گذر چکا ہے: بہت سی تحقیقات سے ثابت ہوتا ہے کہ دیرپا قسم کے حل سے، مثلاً زیادہ سے زیادہ درخت لگانا، جو کہ نوع انسانی کی بقا کے لئے ناگزیر کام ہے، اور توانائی کی زیادہ صاف شکلوں کو بروئے کار لانا، جو کہ توانائی کا طویل المیعاد متبادل ہے، وقت کی اس مدّت میں استفادہ نہیں کیا جا سکتا جو کہ اہمیت رکھتی ہے۔ مسئلہ اصل میں یہی ہے۔ ٹیکنالوجی کئی سروں والی بلا ہے اور شاید بہتر یہی رہے گا کہ محفوظ قسم کے ماضی میں پناہ لے لی جائے اور ٹیکنالوجی میں آنے والی تبدیلیوں سے احتراز کیا جائے؛ اس طرح کی سوچ دلآویز لگتی ہے۔ تاہم اقوام متحدہ کی تحقیقات سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر

www.MashalBooks.org

ہم زمین کے چپے چپے پر بھی درخت لگا دیں تو صدی کے آخر تک ہم صرف اس قابل ہوں گے کہ کاربن ڈائی آکسائیڈ کی اس مقدار کے صرف دس فی صد کا احاطہ کر لیں جس میں کہ ہم کمی لانا چاہتے ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہمیں درخت لگانے کی ضرورت نہیں ہے؛ ہمیں زمین پر متنوع حیات کی خاطر، اور دوسری انواع کے ساتھ مشترکہ طویل المیعاد مستقبل کے لئے ایسا کرتے رہنا چاہیے۔

درخت اور آلودگی سے پاک توانائی طویل المیعاد حل ہیں مگر ہمارے پاس طویل وقت کے لئے انتظار کی گنجائش نہیں ہے۔ ہمیں اس وقت قلیل مدّتی حل کی ضرورت ہے، اور ایک ایسے حل کی جو طویل مدّت میں تبدیلی کے عمل کی حوصلہ افزائی اور معاونت کا کام کرے۔ یہ ٹیکنالوجی ہے جو کہ آئی پی سی سی کے مطابق کاربن ڈائی آکسائیڈ کو ہوا سے براہ راست باہر نکال سکتی ہے۔ میں نے ''گلوبل تھرموسٹیٹ'' نامی ایک کمپنی کی مُشترکہ بنیاد رکھی جو حرارت کے علاوہ صاف اور قدرتی ایندھن (Fossil) کی توانائی کے وسائل، جیسے شمسی توانائی اور ہوا کی طاقت سے بننے والی بجلی کو استعمال کرتے ہوئے ہوا سے کاربن ڈائی آکسائیڈ کے خاتمے کا کام کرتی ہے۔ یہ ایک عارضی حل ہے جو کہ ضروری قسم کے طویل المیعاد حل کے ظہور میں معاونت کرنے کے ساتھ ہی اس عمل کو تیز کر دیتا ہے۔

ترقی پسند اور روایت شکن طبقے میں بہت سے لوگ، بشمول یونین آف کنسرنڈ سائنٹسٹس (UCS) نام نہاد ''ارضی۔کارسازی'' (Geo Engineering) یا زمین کو قابل حیات بنانے کی تدبیروں پر مبنی حل کے حوالے سے نہ صرف شکوک کا اظہار کرتے ہیں بلکہ اس کے مخالف بھی ہیں۔ کیا یہ ماحولیاتی تبدیلی سے انکاری لوگوں پر سکّے کا کمزور رُخ عیاں کرنے کی طرح ہے؟

چومسکی: یہ مجھے کوئی منصفانہ قسم کی تشخیص نہیں لگتی۔ یو سی ایس اور ان کی طرح کے دیگر لوگ صحیح یا غلط ہو سکتے ہیں، تاہم وہ سنجیدہ قسم کی وجوہات پیش کرتے ہیں۔ یہ سنجیدہ سائنسدانوں کے اس چھوٹے سے حلقے کے حوالے سے بھی درست ہے جو وسیع پیمانے کے اتفاق رائے کے حوالے سے شکوک کا اظہار کرتے ہیں، مگر ماحولیاتی تبدیلی سے انکاری عوامی تحریکیں، جیسے ری پبلیکن پارٹی کی قیادت

اور وہ جن کی یہ نمائندگی کرتے ہیں، ایک بالکل ہی مختلف قسم کے لوگ ہیں۔ جہاں تک ارضی کارسازی یا جیوانجینئرنگ کا تعلق ہے، اس حوالے سے سنجیدہ قسم کے تنقیدی جائزے موجود ہیں جو میرے خیال میں نظر انداز نہیں کئے جا سکتے۔ جیسے کلائیو ہملٹن کا بمعہ بہت سی مُثبت تشخیصوں کے۔ یہ کسی ایسی موضوعی رائے (Judgement) کا معاملہ نہیں ہے جو اندازوں یا غیر شعوری احساس (Intuition) پر مبنی ہو۔ بلکہ، اس کے برعکس یہ ایسے معاملات ہیں جن پر سنجیدہ قسم کے غور و فکر کی ضرورت ہے، دستیاب بہترین سائنسی فہم پر انحصار کرتے ہوئے، معقولیت کے ساتھ احتیاطی تدابیر کے حامل اصولوں کو ترک کئے بغیر۔

چپلنسکی: علاج بیماری سے بھی بدتر ہو سکتا ہے۔ مخصوص قسم کے ایسے جیوانجینئرنگ مراحل عمل تجویز کئے جا چکے ہیں جو بہت خطرناک ہو سکتے ہیں اور جن سے لازماً احتراز کرنا چاہئے۔ جیوانجینئرنگ کا مطلب ہے زمین پر بنیادی قسم کے وسیع پیمانے پر ہونے والے (فطری) عمل کو تبدیل کر کے رکھ دیا جائے۔ ہمیں جیوانجینئرنگ کے عمل کے نتائج کے حوالے سے زیادہ علم نہیں ہے، مثلاً فضا میں ایسے ذرات کا چھڑکاؤ جو ہمارے سیّارے اور سورج کی شعاعوں کے درمیان آڑ کا کام کرتے ہیں اور یوں درجہ حرارت کو کم کر سکتے ہیں۔ تاہم اس طرح کا عمل ایسے ہے جیسے زمین پر چھ کروڑ برس قبل ڈائنوسار نامی مخلوق کا ان ذرات کی بدولت صفایا ہو گیا تھا جو کسی آتش فشاں پہاڑ سے نکلے تھے یا پھر ایسا کسی عظیم شہاب ثاقب کے زمین سے ٹکرانے کی بدولت ہوا تھا، اور یوں ہماری نوع انسانی بھی اس طرح کے اثرات کی لپیٹ میں آ سکتی ہے سورج زمین پر ہر طرح کی توانائی کا وسیلہ ہے اور ہم اپنے توانائی کے وسیلے کے ساتھ تجربات کی استطاعت نہیں رکھتے۔ دنیا کے سمندروں میں بھی اس نوعیت کی تبدیلیاں کرنا کہ وہ کاربن ڈائی آکسائیڈ کے انجذاب (Uptake) میں اپنا حصّہ بڑھا دیں، جیسا کہ جیوانجینئرنگ کے دیگر حل اس طرف اشارہ کرتے ہیں، مساوی طور پر خطرناک عمل ہے کیونکہ اس طرح سمندروں میں تیزابیت کی مقدار میں اضافے سے کیکڑے، جھینگے وغیرہ (Crustacean) جیسی مخلوق ہلاک ہو کر رہ جائے گی جو کہ ہمارے علم کے مطابق زمین پر اجرام حیات کی بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔

www.MashalBooks.org

موسمیاتی تبدیلی کے خطرے سے نمٹنے کیلئے فوری نوعیت کے مگر مبنی برحقیقت اور قابل عمل کونسے ایسے اقدامات ہیں جو اُٹھائے جاسکتے ہیں یا اُٹھائے جانے کی ضرورت ہے؟

چومسکی: زیر زمین قدرتی (Fossil) ایندھن کے ذخائر کے استعمال کی فوری روک تھام کے ساتھ ہی قابل تجدید توانائی کی پیداوار میں اضافہ، پائیدار/ماحول دوست توانائی کے نئے وسائل اپنانے کے حوالے سے تحقیق، توانائی کو بچا کر رکھنے کے لئے اہم اقدامات، اور برابر طور پر اہم یہ کہ انسانی اور مادی وسائل استعمال کرنے کے سرمایہ دارانہ نمونے کا دوراس تنقیدی جائزہ لیا جائے؛ حتیٰ کہ اس کی طرف سے خارجی/مادی حقائق سے صرفِ نظر کے علاوہ، مؤخر الذکر انواع کے لئے موت کی گھنٹی سے کم نہیں ہے۔

چپلنسکی: ایک ایسا منصوبہ ہے جو کہ ایسے حقیقت پسندانہ اور قابل نفاذ اقدامات پر مُشتمل ہے جن کی بدولت اب ماحولیاتی خطرے سے نمٹا جاسکتا ہے: ہمیں فضا کو اس کاربن ڈائی آکسائیڈ سے پاک کرنا ہوگا جو صنعتی معیشت کی طرف سے پہلے ہی خارج کی جا چکی ہے، جو بصورت دیگر فضا میں کئی سو برس تک موجود رہے گی اور یوں زمین کی آب وہوا کو مستقل طور پر تبدیل کر کے رکھ دے گی۔ ایسا (یعنی فضا کو پاک) کیا جاسکتا ہے۔ اب ایسی ٹیکنالوجی آ گئی ہے جو فضا کو براہ راست کاربن سے پاک کر سکتی ہے، اور تصدیق شدہ طور پر محفوظ اور کم لاگت ہے۔ یہ نئی ٹیکنالوجی اس طرح کام کرتی ہے کہ کاربن ڈائی آکسائیڈ کو خالص ہوا سے، یا پھر خالص ہوا اور صنعتی وسائل کے مجموعے سے باہر نکال کر رکھ دینے کے لئے ایک ایسا طاقتور وسیلہ استعمال کرتی ہے جو بجلی نہیں ہوتی، بلکہ زیادہ تر ایسی سستی حرارت ہوتی ہے جو اکثر وبیشتر صنعتی عمل کے دوران صرف ہونے سے بچ جاتی ہے۔ ہوا سے نکال دی جانے والی کاربن ڈائی آکسائیڈ کو زمین پر مستحکم کرنے کے لئے اضافی فائدے کے ساتھ مفید تجارتی مقاصد کے لئے فروخت کر دیا جاتا ہے۔ ہوا سے نکل آنے والی کاربن ڈائی آکسائیڈ پیٹرول کی جگہ لے سکتی ہے: یہ پلاسٹک اور ایسی ٹیٹ (Acetate) بنا سکتی ہے، یہ ایسے کاربن فائبر بھی بنا سکتی ہے جو دھات کی جگہ لے لیتے ہیں اور صاف ہائیڈرو کاربن کو نمک سے پاک کرنے اور خضر خانوں (Greenhouse) میں سبزیوں اور پھلوں کی

پیداوار میں اضافے کے لئے بھی استعمال کر سکتے ہیں، اس کے علاوہ مشروبات کو ترش اور جھاگ دار بنانے (Carbonate) اور ایسی حیاتی کھادیں پیدا کرنے کے لئے بھی جو زمین پر زہریلے اثرات چھوڑے بغیر اس کی زرخیزی میں اضافہ کر دیتی ہیں۔ کاربن منفی ٹیکنالوجی اس وقت مطلق ضرورت بن چکی ہے جیسا کہ یو این ایف سی سی سی (یونائیٹڈ نیشنز فریم ورک کنونشن آن کلائمیٹ چینج) کی پانچویں تشخیصی رپورٹ، صفحہ نمبر 191 میں تذکرہ کیا گیا ہے، اور 2015 کے پیرس ایگریمنٹ کی چار دفعات (Articles) میں بھی۔

کیا اس امر کی پیش گوئی کا کوئی طریقہ ہے کہ دُنیا آج سے پچاس برس بعد کیسی لگے گی اگر انسان عالمی حدّت اور موسمیاتی تبدیلی کے عمل سے نمٹنے اور اس کا رُخ پھیرنے میں ناکام ہو گئے تو؟

چومسکی: اگر موجودہ رجحانات برقرار رہے تو نتائج بہت پہلے ہی تباہ کُن برآمد ہوں گے۔ دنیا کے وسیع علاقے بمشکل ہی قابل رہائش ہوں گے، کروڑوں لوگوں کو متاثر کر دیتے ہوئے، اس کے ساتھ ہی ایسی تباہیاں بھی وقوع پذیر ہو جائیں گی جن کا ہم ابھی بمشکل تصور کر سکتے ہیں۔

چپلنسکی: مستقبل تخلیق کرنا اس کی پیش گوئی کرنے کی نسبت آسان تر ہوتا ہے۔ عین اس وقت ضرورت اس امر کی ہے کہ یو۔این انٹر گورنمنٹل پینل آن کلائمیٹ چینج عمل کیا جائے اور اس کے ساتھ ہی پیرس ایگریمنٹ کی سفارشات پر بھی: ہمیں فوری طور پر اس کاربن ڈائی آکسائیڈ سے بھی فضا کو پاک کرنا ہوگا جو ہم پہلے ہی فضا میں چھوڑ چکے ہیں اور کیوٹو معاہدے کے تحت اخراج کی حدود میں بھی توسیع کرنی ہوگی۔ یہ تباہ کن ماحولیاتی تبدیلی کے حوالے سے مختلف مفروضہ صورتوں میں واحد متبادل ہے۔ اس پر عمل ہوسکتا ہے اور لازماً کرنا ہوگا۔

کیوٹو پروٹوکول کاربن مارکیٹ کی طرف سے فراہم کردہ عطیات کی بدولت غریب ممالک میں کاربن منفی توانائی پیدا کرنے والے کارخانے لگائے جا سکتے ہیں۔ کاربن منفی یا کاربن سے پاک توانائی کے کارخانے توانائی فراہم کرنے کے ساتھ ہی غربت پر قابو پانے اور اقتصادی اقدار کو درست سمت میں تبدیلی کے عمل سے گذارنے کا کام بھی کر سکتے ہیں۔

www.MashalBooks.org

یو۔این کاربن مارکیٹ، جسے 2005 سے بین الاقوامی قانون کی حیثیت حاصل ہوچکی ہے، عالمی اقتصادی اقدار میں انتہائی ضروری تبدیلی کا باعث بن جائے گی۔ عالمی سطح پر عوامی اشیا کے لئے نئی منڈیوں کی بدولت اقتصادی اقدار میں لائی جانے والی تبدیلی ہماری عالمی معیشت کو نیا رُخ عطا کرے گی اور درست حالات کے تحت یہ تبدیلی حال اور مستقبل کی بنیادی ضروریات کی تسکین کی راہ بھی ہموار کرسکتی ہے۔ یہی وہ چیز ہے جس کی عین اس وقت ضرورت ہے۔ ہمیں مستقبل کو مضبوط بنانے کی ضرورت ہے نہ کہ انسانی بقا کی بنیادیں کھوکھلی کرنے کی۔ ہمیں یہ کام سرانجام دینا چاہیے۔

ماخذ:

https://chomsky.info/global-warming-and-the-future-of-humanity

www.MashalBooks.org

3- موسمیاتی تبدیلی اور ایٹمی پھیلاؤ کی بدولت انسانوں کو پہلی مرتبہ بدترین خطرے کا سامنا ہے

انٹرویو از طرف ایمی گڈمین، 16 مئی، 2016

ایمی گڈمین: ہم اس وقت نیو یارک میں سڑک پر موجود ہیں، پھر آج ہر طرف (شگاگو)، میڈیسن، وسکنسن، اور پھر وہاں سے ٹورنٹو، کینیڈا روانہ ہوں جائیں گے۔

دا نیو یارک ٹائمز کے مطابق صدر اوباما نے ابھی ابھی ایک ایسا مرحلہ عبور کیا ہے جس پر زیادہ توجہ نہیں دی گئی: وہ اس وقت ایک ایسی جنگ لڑ رہا ہے جو امریکہ کی تاریخ میں کسی بھی صدر کی طرف سے لڑی جانے والی جنگ سے طویل تر جنگ ہے، جارج ڈبلیو بش سے بھی طویل تر، فرینکلن ڈیلانو روز ویلٹ سے بھی طویل تر، ابراہم لنکن سے بھی طویل تر۔ اوباما نے کم از کم سات ممالک میں جنگی اقدامات کئے ہیں: عراق، افغانستان، لیبیا، شام، پاکستان، یمن، اور صومالیہ۔ ابھی پچھلے ماہ ہی صدر اوباما نے شام میں 250 اضافی ''اسپیشل آپریشنز'' فوجی دستوں کے تقرر کا اعلان کیا ہے، ایک ایسی پیش قدمی یا پیشرفت جس کے تحت اس مُلک میں سرکاری سطح پر امریکی باشندوں کی موجودگی میں تقریباً دُگنا اضافہ ہو جائے گا۔

جنگ کے پوری دنیا میں پھیلاؤ کے ساتھ ہی چھ کروڑ لوگوں کی یادگار تعداد کو گذشتہ برس گھر چھوڑنے پر مجبور ہونا پڑا۔ ماہرین نے خبردار کیا ہے کہ پناہ گزینوں کا بحران عالمی حدّت کے اثرات کی بدولت بدتر بھی ہوسکتا ہے۔ ہفتے کے اختتام پر ناسا (NASA) کے جاری کردہ اعداد و شمار سے ظاہر ہوتا ہے کہ 2016 اب تک کا گرم ترین سال بننے کی جانب تیزی سے گامزن ہے اور 2015 کا ریکارڈ بھی توڑنے لگا ہے۔ اپریل کا مہینہ تسلسل کے ساتھ وہ ساتواں مہینہ بن گیا جس

نے عالمی درجہ حرارت کے سارے ریکارڈ توڑ ڈالے ہیں۔ اسی دوران، بہت سے لوگوں کو خدشہ ہے کہ ایٹمی اسلحے کی ایک نئی دوڑ خاموشی سے شروع ہو چکی ہے، کیونکہ امریکہ، روس، اور چین میں چھوٹے ایٹمی اسلحے کے ذخائر کی تعمیر کا مقابلہ شروع ہو چکا ہے۔ کثیر تعداد میں یہ بحران اس وقت سر اُبھار رہے ہیں جبکہ رائے دھندگان امریکہ میں ایک نئے صدر کے انتخاب کی تیاری کر رہے ہیں۔

دنیا کو درپیش آزمائشوں اور امریکہ میں انتخابات کی صورتحال سے کوئی مفہوم اخذ کرنے کے لئے ہمارے ساتھ اس وقت دنیا کے ایک ممتاز دانشور نوم چومسکی بھی موجود ہیں، جو میساچوسٹس انسٹیٹوٹ آف ٹیکنالوجی میں، اعزازی (سبکدوشی کے بعد) پروفیسر کے طور پر خدمات سرانجام دے رہے ہیں، جہاں کہ وہ نصف صدی سے زائد عرصہ تدریس کرتے رہے۔ ان کی تازہ ترین تصنیف/کتاب کا عنوان ہے ''ہو رولز دا ورلڈ'' یعنی دنیا پر دراصل کون حکمرانی کر رہا ہے؟

نوم چومسکی صاحب، ایک بار پھر جمہوریت کی طرف خوش آمدید! آپ کی یہاں موجودگی ہمارے لئے باعثِ فخر ہے۔

نوم چومسکی: آپ سے دوبارہ ملاقات خوشی کا باعث ہے۔

ایمی گڈمین: تو نوم، آپ کے خیال میں دنیا پر کون حکومت کر رہا ہے؟

نوم چومسکی: اس کا انحصار، کسی حد تک، ہمارے اوپر ہے۔ عام لوگوں کے لئے دنیا پر حکمرانی کرنا کوئی ناممکن کام نہیں ہے، مگر انہیں اس مقصد کے حصول کے لئے جدوجہد کرنی پڑے گی۔ اور اگر وہ ایسا نہیں کرتے تو پھر دنیا پر طاقت کے ارتکاز کا راج ہوگا، اقتصادی طاقت کا، ریاستی طاقت کا، جو قریبی ربط کی حامل ہیں ایسے نتائج کے ساتھ جو اس طرح کے ہیں جو آپ بیان کرتے ہیں۔ تاہم یہ ایک ترجیح ہے۔

ایمی گڈمین: امریکہ عالمی سطح کی گفت شنید/مکالمے کے لئے کس طرح سے شرائط کا تعین کرتا ہے، اور، بہ حیثیت مجموعی، دنیا میں کیا ہو رہا ہے؟

نوم چومسکی: خوب، یہ بنیادی طور پر دوسری جنگ عظم کا نتیجہ ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے اختتام پر

www.MashalBooks.org

امریکہ کی طاقت اور تقابلی دولت اس درجے پر پہنچ چکی تھی جس کی تاریخ میں کوئی نظیر نہیں ملتی تھی۔ وہ عملی طور پر دنیا کی نصف دولت کا مالک بن چکا تھا۔ اس کے تحفظ/ دفاع کی صورتحال بھی بے مثال تھی، نصف کرّہ ارض، دونوں سمندر، دونوں سمندروں کے مخالف کنارے اس کی گرفت میں تھے۔ جنگی/فوجی نقطۂ نظر سے اس کی حیثیت بہت ہی زیادہ نمایاں تھی۔ دیگر صنعتی معاشرے تباہی یا شدید کمزوری کا شکار ہو چکے تھے۔ جنگ کا اصل میں امریکی معیشت کو بہت فائدہ ہوا تھا۔ اس کے نتیجے میں کساد بازاری ختم ہو گئی تھی۔ صنعتی پیداوار تقریباً چار گُنا بڑھ گئی تھی۔ قرضہ اتنا تھا کہ شرح افزائش میں اضافہ کر کے اس سے آسانی سے چھٹکارا حاصل کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ امریکہ دراصل اس مقام پر پہنچ چکا تھا کہ عملاً سارے کے سارے عالمی نظام کے لئے شرائط کا تعین کر سکتا تھا۔

تاہم یہ صورتحال ہمیشہ برقرار نہیں رہ سکتی تھی، بلاشُبہ، اور تیزی سے کمزور ہوتی چلی گئی، اگرچہ، گذشتہ کئی برسوں کے دوران رونما ہونے والی تبدیلیوں کے ساتھ، امریکہ ابھی تک نمایاں حیثیت کا حامل ہے بمعہ ناقابل موازنہ فوائد کے اور ہو سکتا ہے کہ ابھی بھی دنیا کے ایک چوتھائی وسائل کا مالک ہو۔ جنگی لحاظ سے، اسی پیمانے پر، امریکہ کا کوئی ثانی نہیں ہے۔ یہ واحد ملک ہے جس کے پاس پوری دنیا میں سینکڑوں، بلکہ ممکنہ طور پر، ہزاروں فوجی اڈے ہیں، اور ساری دنیا میں اس کے فوجی دستے بھی موجود ہیں۔ امریکہ کے فوجی اخراجات تقریباً باقی ماندہ دنیا کے ممالک کے مجموعی مصارف کے برابر ہیں اور ٹیکنالوجی کے حوالے سے یہ بہت زیادہ ترقی یافتہ ملک ہے۔ اور تقریباً 70 برس کے اس تناظر کے اندر رہتے ہوئے، امریکہ کا دنیا کے معاملات میں عموماً، اچھا خاصا غالب کردار رہا ہے اور اس بنیادی دائرہ عمل کے تعین کے حوالے سے بھی جس کے اندر رہ کر دوسرے ممالک سرگرمیاں کرتے ہیں، بلاشبہ کسی تصادم سے بچ کر نہیں۔

ایمی گڈمین: آپ آج کی دنیا کو درپیش دو اہم خطرات کی بات کرتے ہیں: ایٹمی تصادم اور موسمیاتی تبدیلی۔ ہر ایک کے بارے میں اظہار خیال کریں۔

نوم چومسکی: خوب، میں بات کا آغاز ''ایٹمی سائنس دانوں کے خبرنامے کی یوم حشر کی ساعت'' (Doomsday Clock of the Bulletin of Atomic Scientists) کے حوالے کے ساتھ بھی کر

سکتا تھا، ایک گھڑی جس کا مطلب یہ ہے کہ 1947 کے وقت سے، ایٹم بم گرائے جانے کے کچھ عرصہ بعد ہی انہوں نے یوم حشر کی ساعت کا تعین کر دیا تھا۔ ہر برس، ماہرین کا ایک اکٹھ اس امر کا تخمینہ لگاتا ہے کہ ہم نصف شب کے کتنے قریب پہنچ چکے ہیں۔ نصف شب کا مطلب ہے انواع کے خاتمے کی گھڑی۔ یہ کئی برسوں سے اوپر نیچے کی جاتی رہی ہے۔ عین اس وقت، یعنی کوئی پچھلے برس اسے نصف شب سے دو منٹ قریب کر دیا گیا، کیونکہ وہ خطرات جن کا آپ نے ذکر کیا ہے اس برس بھی اپنی جگہ قائم تھے۔ اس کا مطلب ہے نصف شب میں تین منٹ باقی ہیں، جیسا کہ یہ 1980 کے عشرے سے ہی اتنی قریب پہنچ چکی ہے، جب جنگ کا شدید خطرہ منڈلا رہا تھا۔ اس وقت اسے بہت سنجیدگی سے لیا گیا تھا۔ اب جبکہ روسی یادداشتوں کا پلندہ پھر سے عیاں کیا جا چکا ہے، تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ یہ اس سے کہیں زیادہ سنجیدہ خطرہ تھا جتنا کہ ہم فرض کر رہے تھے۔ ایک مقام پر تو یہ خطرہ محض چند منٹ کی دوری پر ہی رہ گیا تھا، بلکہ درحقیقت کئی مواقع پر ہم ایٹمی جنگ سے محض منٹوں دور تھے۔ یہی وہ صورتحال ہے جس کے لئے یوم حشر کی ساعت'' کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔

ایٹمی خطرہ ایک خطرہ ہے، روس کی سرحد پر، جو کہ حملے کا ایسا راستہ ہے جہاں سے روس کو تقریباً تباہ کر دیا گیا تھا، گذشتہ صدی میں صرف جرمنی کی طرف سے دو مرتبہ۔ جی ہاں جرمنی کی طرف سے ایک مخالف فوجی اتحاد کے فریق کی حیثیت سے، اس سے سرحد پر، دونوں فریق یوں ظاہر کر رہے ہیں جیسے جنگ کے بارے میں سوچا بھی نہیں جا سکتا۔ امریکہ نے اس طرف اپنے جنگی اخراجات میں بہت تیزی سے اضافہ کرتے ہوئے انہیں چار گُنا کر ڈالا ہے۔ روس بھی کچھ اسی طرح کر رہا ہے۔ ایک مسلسل امکانی تصادم کی صورتحال ہے، جیٹ طیارے ایک دوسرے سے اتنے قریب سے گذر جاتے ہیں کہ ٹکرانے سے بال بال بچ جاتے ہیں۔ ایک روسی جیٹ طیارے نے کوئی دو ماہ قبل ڈنمارک کے ایک تجارتی جہاز کو عملاً ٹکر مار ہی دی تھی۔ امریکی فوجی دستے تقریباً روسی سرحد کے اوپر ہی نقل و حرکت کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ کہ خطرہ بڑھتا جا رہا ہے اور بہت سنجیدہ نوعیت کا ہے۔ ولیم پیری، ایک معزز ایٹمی ماہر اور سابق ڈیفنس سیکرٹری، نے حال ہی میں تخمینہ لگایا ہے کہ اب کی بار خطرہ 1980 کی دہائی کی نسبت زیادہ ہے۔ اسی طرح چین، جنوبی چینی

سمندر اور دیگر علاقوں میں چینیوں کے قریب بھی تصادم کے واقعات رونما ہو رہے ہیں ۔ یہ بھی ایک اہم خطرہ ہے۔

دوسرا وہ جس کا آپ نے ابھی ذکر کیا ہے۔ عالمی حدّت کا خطرہ بہت سنجیدہ نوعیت کا ہے۔ ہر مرتبہ جب آپ کسی سائنسی جریدے کا مطالعہ کرتے ہیں تو ایک اور ہولناک دریافت آپ کے سامنے ہوتی ہے۔تقریباً تقریباً سارے برفانی تودے یا ڈلے پگھل رہے ہیں۔ منطقہ قطب شمالی (Arctic) کی برف ، جو کہ مفروضہ طور پر کافی مستحکم تھی ، دراصل بڑی تیزی سے پگھل رہی ہے ، ہماری سوچ سے بھی زیادہ تیزی سے ۔ برفانی تودے بھی پگھل رہے ہیں ۔قحط سالی کے واقعات شدّت اختیار کرتے جا رہے ہیں، عین اس وقت ، انڈیا میں 30 کروڑ کے لگ بھگ لوگ قحط کی بدولت پہلے سے ہی فاقہ کشی کی حالت میں آ چکے ہیں، ایک ایسی صورتحال جو کئی برسوں سے جاری ہے ۔ ہمالیہ کے برفانی تودوں کے پگھلنے کے ساتھ ساتھ زیر زمین پانی کی سطح گرتی جا رہی ہے ۔ اس کے نتیجے میں جنوبی ایشیا میں بہت سے علاقوں کو پانی کی قلت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اگر لوگوں کے خیال میں اس وقت نقل مکانی کا بحران پیدا ہو چکا ہے تو انہوں نے کچھ بھی مشاہدہ نہیں کیا۔ سطح سمندر میں اضافہ ہو رہا ہے۔ امکان یہ ہے کہ اس میں تین سے چھ فٹ کا اضافہ ہو جائے گا۔ ہو سکتا ہے اس سے بھی زیادہ ہو جائے ، اس صدی کے اواخر تک اور نصف تخمینوں کے مطابق اس سے بھی پہلے ۔ اس کے تباہ کُن اثرات ہوں گے ، نہ صرف ساحلی شہروں پر بلکہ ساحلی میدانوں پر بھی ، جیسے مثال کے طور پر بنگلہ دیش ، جہاں لاکھوں ، کروڑوں لوگوں کی زندگیوں کو شدید خطرات لاحق ہو جائیں گے ۔ میرا مطلب ہے کہ ہم دیگر انواع کو پہلے سے ہی اتنی تیزی سے ہلاک کر رہے ہیں جو معدوم ہونے کے نام نہاد پانچویں مرحلے (Fifth Extinction) کی طرح کا عمل لگتا ہے۔ ساڑھے چھ کروڑ برس پہلے ، جب ایک سیارہ زمین سے ٹکرایا تھا تو اس کے تباہ کن نتائج کے طور پر ڈائنوسار کے دور کا خاتمہ ہو گیا ، چھوٹے ممالیہ جانوروں کی افزائش کی راہ ہموار ہو گئی جو آخر کار ارتقائی عمل سے گذرنے کے بعد موجودہ نوع انسانی کی صورت اختیار کر گئے جو کہ اب اسی طرز عمل کا مظاہرہ کر رہی ہے جیسا زمین سے ٹکرانے والے سیارے کا تھا۔ یعنی معدوم ہونے کے پانچویں دور جیسا۔ اس مرتبہ حالات اور بھی بدتر ہوں گے ۔ ہر لحاظ سے ، عالمی حدّت میں اضافے کی رفتار پہلے سے کہیں بہت زیادہ ہو چکی ہے ، کسی بھی ایسے قابل موازنہ معتدل دور کے مقابلے میں سو گنا یا

شاید اس سے بھی زیادہ جس کا تخمینہ ارضیاتی ریکارڈ سے لگایا جا سکتا ہے۔

اور ان دو عظیم خطروں کے ساتھ حالات مزید ابتر کرنے کے لئے ہمارے پاس ایک انتخابی ادارہ (Electoral) بھی ہے، ہر چار برس بعد ہونے والے انتخابی عمل کی عیاشی کا سلسلہ، بلاشبہ، ابھی تک جاری ہے۔ اور یہ بات خاص طور پر ملاحظہ کی جا سکتی ہے کہ وہ بدترین خطرات جن کا نوع انسانی کو کبھی سامنا رہا ہے، وہ اہم ترین فیصلے جو لازماً کرنے پڑیں گے، اور بہت جلد، ان کا مباحثوں اور مذاکروں میں عملاً کوئی ذکر ہی نہیں ہے۔ ڈیموکریٹس کی جانب سے کبھی کبھار ایک دو تبصرے کر دیئے جاتے ہیں، مگر اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ ری پبلکن کی طرف سے اور بھی بدتر کارکردگی کا مظاہرہ کہا جاتا ہے۔ ہر ایک اُمیدوار یا تو عالمی حدّت سے بالکل ہی انکاری ہوتا ہے ، یا پھر، ایک مثال میں، کاسچ (Kasich) اس امر کو تسلیم کرتا ہے کہ ایسی صورتحال وقوع پذیر ہو رہی ہے مگر یہ بھی کہ ہمیں اس حوالے سے کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہے جو کہ اس سے بھی بدتر صورتحال ہے۔

ایمی گڈ مین: نوم۔

نوم چومسکی: یہ سو فی صد درست ہے۔

ایمی گڈ مین: نوم اب ہم وقفہ کرنے لگے ہیں۔ جب ہم واپس آ جائیں گے تو پھر مقابلے کی دوڑ میں شامل آخری ریپبلکن کے بارے میں بھی قیاس آرائی یا تبصرہ کریں گے، یعنی ڈونالڈ ٹرمپ کے موسمیاتی تبدیلی کے بارے میں خیالات پر اور یہاں امریکہ میں ہونے والی 2016 کے صدارتی انتخابات کے حوالے سے بحیثیت مجموعی تمہاری رائے بھی لیں گے۔ نوم چومسکی، عالمی سطح پر معروف سیاسی ناقد، ماہر لسانیات، اور مُصنف کی نئی کتاب آ گئی ہے: اس کا عنوان ہے ''ہو رولز دا ورلڈ؟'' ہمارے ساتھ رابطے میں رہیں۔

ماخذ:

https://www.youtube.com/watch?v=oKuhBAyCoxk

www.MashalBooks.org

4- انسانی ذہانت اور ماحولیات

(نوم چومسکی، یونیورسٹی آف نارتھ کیرولائنا، 30 ستمبر، 2010)

میں ایک ایسے دلچسپ مباحثے سے آغاز کروں گا جو چند برس قبل کارل سگان، معروف ماہر فلکیاتی طبیعیات (Astrophysicist) اور ارنسٹ میئر، امریکی حیاتیات کے پرانے ماہر، کے درمیان ہوا تھا۔ وہ کائنات میں کسی اور جگہ پر ذہین مخلوق کی موجودگی کے امکان پر تبادلہ خیال کر رہے تھے۔ اور سگان نے ایک ماہر فلکیاتی طبیعیات کے طور پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے یہ نکتہ عیاں کیا کہ ہماری زمین کی طرح کے اور بھی بے شمار سیارے پائے جاتے ہیں۔ ایسی کوئی وجہ نہیں ہے کہ وہاں ذہین مخلوق آباد نہ ہوئی ہوگی۔ میئر نے ایک ماہر حیاتیات کے نقطۂ نظر سے دلیل دیتے ہوئے کہا کہ اس امر کا کوئی امکان نہیں ہے کہ ہم کبھی اس طرح کی مخلوق دریافت کر سکیں۔ اور اس کی دلیل، بقول اس کے، یہ تھی کہ ہمارے سامنے صرف ایک ہی مثال ہے: زمین۔ چنانچہ ہم اس کا جائزہ لیتے ہیں۔

اور اس کی بنیادی طور پر دلیل یہ تھی کہ ذہانت ایک قسم کی مُہلک جینیاتی تبدیلی (Mutation) ہے۔ اور یہ ایک مناسب دلیل تھی۔ اس نے یہ نکتہ عیاں کیا کہ اگر آپ حیاتیاتی کامیابی پر نظر ڈالیں، جس کی ناگزیر طور پر پیمائش اس حقیقت کی بدولت ہوتی ہے کہ ہم میں سے اب کتنے ہیں جو یہاں باقی رہ گئے ہیں، وہ نامیے (حیاتی اکائیاں) جو اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کرتے ہیں وہ ہیں جو بڑی تیزی سے پروان چڑھ جاتے ہیں، جیسے بیکٹیریا، یا پھر وہ جو ماحولیاتی تنوع کے اندر اپنے مخصوص مقام پر ہی جمے ہوئے ہیں، جیسے بھونرا (Beetle) یہ اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اور یہ ماحولیاتی بحران کو جھیلنے کی صلاحیت کے حامل ہو سکتے ہیں۔ تاہم جیسے

جیسے آپ اس شے کے پیمانے پر اوپر کی طرف جاتے ہیں، جسے کہ ہم ذہانت کہتے ہیں، تو کامیابی کم سے کم ہوتی چلی جاتی ہے۔ جب آپ ممالیوں تک پہنچ جاتے ہیں تو ان میں سے بہت ہی کم ایسے ہوتے ہیں جو اتنے کامیاب ہوں جتنے کہ، مثال کے طور پر، کیڑے یا حشرات۔ جب آپ انسانوں تک پہنچ چکے ہوتے ہیں، جن کی کہ ابتدا ایک لاکھ برس قبل ہونے کا امکان ہے، پھر تو بہت ہی محدود گروہ نظر آتا ہے۔ ہم اس وقت ایک قسم کی گمراہ مخلوق بن چکے ہیں کیونکہ اب تو انسانوں کی تعداد ہر جگہ کافی زیادہ نظر آتی ہے، مگر یہ اب محض ہزاروں برس کا معاملہ ہے جو کہ ارتقائی عمل کے نقطۂ نظر سے کوئی مفہوم نہیں رکھتا۔ اس کی دلیل کا نچوڑ یہ تھا کہ آپ کو کسی قسم کی ذہین مخلوق کہیں نہیں ملنے والی، اور غالباً یہاں زمین پر بھی اس کا وجود زیادہ عرصہ برقرار نہیں رہے گا کیونکہ یہ ایک مہلک قسم کی جینیاتی تبدیلی یا وراثتی خاصیت ہے۔ اس نے، کسی حد تک بدشگونی کے انداز میں، مزید اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا کہ اربوں کی تعداد میں زمین پر موجود رہنے والی انواع کی اوسط مدّتِ حیات لگ بھگ ایک لاکھ برس ہے جو کہ بمشکل اتنی ہی بنتی ہے جتنا وقت کہ جدید دور کا انسان یہاں موجود رہا ہے۔

ماحولیاتی بحران کے ساتھ اب ہمیں ایک ایسی صورتحال درپیش ہے جہاں ہم یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ آیا میئر کا موقف درست تھا یا نہیں۔ اگر اس حوالے سے کچھ نہ کیا گیا اور وہ بھی جلد از جلد، تو پھر اس کی بات درست ثابت ہو جائے گی: انسانی ذہانت بلاشبہ، ایک مُہلک جینیاتی تبدیلی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کچھ انسان بقیدِ حیات رہ جائیں، تاہم یہ بکھرے ہوئے لوگ ہوں گے اور کوئی عمدہ یا معیاری زندگی نہیں گذار رہے ہوں گے، اور ہمیں بہت سی باقی ماندہ زندہ دنیا کو بھی اپنے ساتھ لے کر چلنا پڑے گا۔

تو کیا اس حوالے سے کچھ کیا جا رہا ہے؟ امکانات اتنے خوش کُن نہیں ہیں۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے، اس موضوع پر گذشتہ دسمبر میں ایک بین الاقوامی کانفرنس ہوئی تھی۔ مکمل طور پر ناکام۔ اس کا کوئی بھی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ ابھرتی ہوئی معیشتوں، چینی، بھارتی، اور دیگر کی دلیل کے مطابق یہ ان کے ساتھ ناانصافی ہے کہ وہ موجودہ امیر اور ترقی یافتہ معاشروں کی دو سو برسوں پر محیط

ماحولیاتی بربادی کا بوجھ برداشت کرتے رہیں۔ یہ ایک معقول دلیل ہے۔ تاہم یہ اس طرح کی صورتحال کی ایک مثال ہے جہاں آپ جنگ کا ایک مرحلہ تو جیت سکتے ہیں مگر پوری جنگ ہار دیتے ہیں۔ یہ دلیل ان کے لئے کسی طرح سے کارآمد نہیں ہونے لگی، اگر، حقیقت میں، ماحولیاتی بحران میں اضافہ ہو جاتا ہے اور معاشرے کی قابل فہم تعداد اس کو قبول کر لیتی ہے۔ اور، بلاشبہ، غریب مما لک، جن کے ایماء پر یہ بول رہے ہیں، بُری طرح متاثر ہو کر رہ جائیں گے۔ اصل میں تو وہ پہلے سے ہی لپیٹ میں آچکے ہیں۔ اور یہ صورتحال برقرار رہے گی۔ امیر اور ترقی یافتہ معاشرے تھوڑی سی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جائیں گے۔ یورپ اصل میں کچھ نہ کچھ کر رہا ہے؛ یہاں اخراج کو مناسب سطح پر رکھنے کے لئے کچھ اقدامات اُٹھائے گئے ہیں۔ امریکہ نے کچھ بھی نہیں کیا۔

دراصل، ماحولیات کے حوالے سے لکھنے والا ایک معروف قسم کا لکھاری، جارج مونبیاٹ بھی ہے، جس نے کوپن ہیگن کانفرنس کے بعد لکھا تھا کہ ''کانفرنس کی ناکامی کی وضاحت دو الفاظ میں کی جاسکتی ہے: باراک اوباما۔'' اور اس نے درست کہا ہے۔ کانفرنس میں اوباما کی مداخلت یا شرکت، بلاشُبہ، بہت اہمیت کی حامل تھی، کسی بھی بین الاقوامی پروگرام میں امریکہ کے اثر ورسوخ اور کردار کو مدّ نظر رکھتے ہوئے۔ اور اس نے بنیادی طور پر اسے ناکام بنا دیا۔ کوئی پابندیاں عائد نہ ہوئیں اور یوں کیوٹو پروٹوکول بے جان ہو کر رہ گیا۔ امریکہ نے اس میں کبھی شمولیت ہی نہ کی۔ آلودہ گیسوں کے اخراج کی سطح اس وقت سے ہی امریکہ میں تیزی سے بڑھ چکی ہے اور ان کو روکنے کے لئے کچھ بھی نہیں کیا جا رہا۔ تھوڑی بہت اشک شوئی کے علاوہ بنیادی طور پر کوئی ٹھوس اقدامات نہیں کئے جا رہے۔ یقیناً مسئلہ صرف باراک اوباما کا ہی نہیں ہے۔ یہ سارے کے سارے معاشرے اور ثقافت کا مسئلہ ہے۔ ہمارے اداروں کو کچھ اس طرح سے مباخث کیا گیا ہے کہ کسی بھی مقصد کے حصول کی کوشش بہت مشکل ہوتی ہے۔

عوام کے طرزِ عمل کا مشاہدہ کرنا ذرا مُشکل امر ہے۔ رائے عامہ کے بہت سے جائزے موجود ہیں اور یہ اس طرح نظر آتے ہیں جیسے مختلف نتائج کی عکاسی کر رہے ہوں، اس امر پر انحصار کرتے ہوئے کہ آپ سوالوں اور جوابوں کی عین کیا تشریح کرتے ہیں۔ تاہم آبادی کا ایک خاطر

خواہ حصہ، یا بڑی اکثریت کہہ لیں، اسے ایک طرح سے آزاد خیال حلقوں کی طرف سے مذاق یا شوشہ بازی قرار دے کر مسترد کر دینے کو ترجیح دیتا ہے۔ بڑے کاروباری اداروں (Corporate Sector) کا کردار خاص طور پر دِلچسپی کا باعث ہے، جو اس ملک کے انتظام اور سیاسی نظام پر خاطر خواہ اثر انداز ہوتے ہیں۔ یہ کافی حد تک نمایاں خیالات رکھتے ہیں۔ بڑے بڑے کاروباری ادارے/حلقے، مثلاً چیمبر آف کامرس، امریکن پٹرولیم انسٹیٹیوٹ، اور دیگر، بہت واضح اور نمایاں موقف کے حامل ہیں۔ کوئی دو برس قبل ان کا بیان تھا کہ وہ جلد ہی جاری کرنے لگے ہیں، اور اس وقت سے ہی جاری کئے ہوئے ہیں، بڑے پیمانے کی ایسی تشہیری مُہم جس کا مقصد لوگوں کو اس امر پر قائل کرنے کے لئے کہ یہ سب حقیقت نہیں ہے، یہ محض آزاد خیال کرنے کے لئے کہ یہ سب حقیقت نہیں ہے، یہ محض آزاد خیال حلقوں کی طرف سے چھوڑا گیا شوشہ ہے۔ رائے عامہ کے جائزوں سے پتہ چلتا ہے کہ اس مُہم کے اثرات مرتب ہوئے تھے۔

ان لوگوں پر نظر ڈالنا بھی خاص طور پر دلچسپی کا باعث ہے جو اس طرح کی مہمیں چلا رہے ہیں، یعنی بڑے کاروباری اداروں کے انتظامی سربراہان۔ انہیں بھی اچھی طرح معلوم ہے جس طرح آپ کو اور مجھے کہ خطرات واقعی بہت شدید ہیں، اور یہ کہ وہ اپنے پوتے/پوتیوں اور نواسے/نواسیوں کی زندگیاں خطرے میں ڈال رہے ہیں۔ دراصل، وہ اسی شے کو خطرے میں ڈال رہے ہیں جس کے وہ مالک ہیں، وہ دنیا کے مالک ہیں، اور وہ اسی کی بقا کو خطرے میں ڈال رہے ہیں۔ جو کہ نامعقول لگتا ہے، اور ایسے ہی ہے، اگر مخصوص تناظر میں دیکھا جائے تو۔ وہ عین انہی اداروں کی ساخت کے اندر رہتے ہوئے سرگرم عمل ہیں جس کا وہ بھی حِصّہ ہیں۔ یہ لوگ منڈی کے نظام تو نہیں، مگر کسی حد تک۔ اس حد تک کہ آپ منڈی کے ایک نظام میں شریک عمل ہیں، آپ اس کو ضروری طور پر نظر انداز کر دیتے ہیں جسے معیشت دان ''خارجی عوامل'' کہتے ہیں، یعنی کسی لین دین کا دوسروں پر اثر۔ لہٰذا مثال کے طور پر، اگر آپ میں سے کوئی شخص مجھے کار فروخت کرتا ہے تو ہم دونوں کی کوشش ہوگی کہ اپنے حق میں بہتر قسم کا لین دین کریں، مگر ہم اس لین دین کے دوران اس امر کو پیش نظر نہیں رکھتے کہ اس کے دوسروں پر کیا اثرات مرتب ہوں گے۔ بلاشُبہ، اس کا ایک

طرح سے اثر تو پڑے گا۔ ہوسکتا ہے کہ ہمیں یہ اثر اتنا اہم نہ لگتا ہو، تاہم اگر یہ اثر پھیل کر بہت سے لوگوں کو لپیٹ میں لے لےتو پھر یہ بہت عظیم اثر ہوگا: آلودگی، گھٹن، رُک رُک کر چلنے والی گاڑیوں کا اژدھام اور یوں اس کی بدولت وقت کے ضیاع، اور دیگر متفرق مسائل کی صورت میں۔آپ ان مسائل کو، ضروری طور پر، خاطر میں نہیں لاتے ۔ یہ منڈی کے نظام کے مطابق ہوتا ہے۔

ہم حال میں ہی اس صورتحال کی بڑے پیمانے پر عکاسی ہوتے ملاحظہ کر چکے ہیں۔ مالی بحران کی بہت سی وجوہات ہوتی ہیں، تاہم اس کا بنیادی سبب طویل عرصے سے معلوم چلا آرہا ہے۔اس کو بحران سے کئی عشرے قبل زیر بحث لایا جارہا ہے۔درااصل بحرانوں کی تکرار ہوتی رہی ہے۔یہ محض ان میں سے بدترین بحران ہے۔اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ اس کی جڑیں منڈی کے نظام میں پیوست ہوتی ہیں۔اگر گولڈمین ساچس، مثال کے طور پر، کوئی لین دین کرتا ہے، اگر وہ اپنا کام کر رہے ہیں، اگر منتظمین اس رفتار کی استطاعت رکھتے ہیں جس رفتار سے وہ اس امر کی طرف متوجہ ہو رہے ہے کہ انہیں اس کا کیا فائدہ ہوگا، اور لین دین کا دوسرا فریق بھی کوئی ادارہ یا فرد، مثال کے طور پر قرض لینے والا، وہی کچھ کرتا ہے۔وہ اس عنصر کو پیش نظر نہیں رکھتے جسے کہ ''باضابطہ خطرہ'' کہا جاتا ہے، یعنی اس امر کا امکان کہ وہ جیسا لین دین کر رہے ہیں وہ پورے کے پورے نظام کو ملیا میٹ کر کے رکھ دینے میں اپنا کردار ادا کرے گا۔وہ اس شے کو مدّنظر نہیں رکھتے۔اصل میں جو کچھ بھی وقوع پذیر ہوا ہے اس میں اس کا وسیع تر کردار ہے۔نظام کو درپیش خطرہ بہت بڑا ثابت ہوا، پورے کے پورے نظام کو تباہ کرنے کے لئے کافی، اگرچہ اصل لین دین اس نظام کے اندر مکمل طور پر معقولیت کا حامل ہوتا ہے۔

ایسا نہیں ہے کہ یہ لوگ بداصل یا پاجی ہوتے ہیں۔اگر وہ ایسا نہیں کرتے، مثال کے طور پر اگر کوئی سی ای او کہتا ہے، ''میں خارجی صورتحال کو مدّنظر رکھنے لگا ہوں''، تو پھر اسے نکال باہر کیا جائے گا۔اور اس کو نکال کر کسی اور کو رکھ لیا جائے گا جو کہ اصولوں کی پیروی کرے گا۔ یہ ادارے کی یا نظام کی نوعیت ہوتی ہے۔آپ اپنی ذاتی زندگی میں مکمل طور پر نفیس شخصیت کے

مالک ہوسکتے ہیں۔آپ سیئرا کلب(Sierra Club) کی رُکنیت حاصل کر سکتے ہیں۔اور تقریبات کے دوران ماحولیاتی بحران کر سکتے ہیں اور تقریبات کے دوران ماحولیاتی بحران پر یا اسی قسم کی اور تقریریں بھی کر سکتے ہیں، تاہم کاروباری ادارے کے منتظم کے طور پر آپ کا کردار متعین ہوتا ہے۔آپ نے مختصر مدّت میں زیادہ سے زیادہ منافع کمانا اور منڈی سے زیادہ سے زیادہ حصّہ وصول کرنے کی کوشش کرنی ہوتی ہے۔حقیقت تو یہ ہے کہ اینگلو۔امریکن کارپوریٹ لاء کے تحت تو یہ ایک قانونی تقاضا ہوتا ہے، کیونکہ اگر آپ ایسا نہیں کریں گے تو یا تو آپ کا کاروبار ہی ختم ہو کر رہ جائے گا اس وجہ سے کہ کوئی کاروباری حریف آپ سے بازی لے جائے گا، یا پھر آپ کو نکال باہر کر دیا جائے گا کیونکہ آپ اپنا کام درست طریقے سے سرانجام نہیں دے رہے اور آپ کی جگہ کوئی اور لے لے گا۔ چنانچہ ایک قسم کی منظم نامعقولیت پائی جاتی ہے۔اداروں کے اندر یہ طرز عمل بالکل معقول ہوتا ہے، تاہم ادارے بذات خود اس قدر نامعقول قوانین / مقاصد کی پیروی کرتے ہیں کہ تباہی و بربادی ان کی ساخت میں ہی مُضمر ہوجاتی ہے۔

اگر آپ، مثال کے طور پر، مالیاتی نظام پر نظر ڈالیں، تو جو کچھ ہوا وہ انتہائی ڈرامائی لگتا ہے۔ 1920 کے عشرے میں بھی ایک زوردار بحران آیا تھا اور 1930 کے عشرے میں بھی شدید کساد بازاری کا دور۔ تاہم اس وقت قواعد وضوابط کا طریقہ متعارف کروا دیا گیا تھا۔ یہ قواعد وسیع تر عوامی دباؤ کے پیشِ نظر متعارف کروائے گئے تھے، مگر پھر بھی متعارف ضرور ہوئے تھے۔اور پھر پوری دنیا میں اگلے دو عشروں پر مُشتمل تیز رفتار اور ہمہ گیر مساوات پر مبنی اقتصادی ترقی کا ایک زبردست دور دیکھنے میں آیا۔اس دوران کوئی مالیاتی بحران پیدا نہ ہوا کیونکہ قواعد وضوابط کے طریقہ کار کے تحت منڈی کے عمل میں مداخلت کی جاتی اور منڈی کے اصولوں کو فعال نہ ہونے دیا جاتا۔ چنانچہ اس صورت میں آپ خارجی صورتحال کی پیش نظر رکھ سکتے تھے۔یہی کچھ ہوتا ہے جو قواعد وضوابط والا نظام کرتا ہے۔ تاہم اس نظام سے باقاعدہ طریقے سے 1970 کی دہائی میں چھٹکارا حاصل کر لیا گیا۔

اس دوران معیشت میں مالیات کا کردار بڑی تیزی سے نمایاں ہو کر رہ گیا۔ مالیاتی

www.MashalBooks.org

اداروں کا اجتماعی منافع میں حصہ 1970 کی دہائی سے بڑھتا چلا آ رہا ہے۔ اس کی ایک مثال صنعتی پیداوار کو باہر بھیج کر اسے مزید کمتر کر کے رکھ دینے کی ہے۔ یہ سب کچھ ایک طرح کے جنونی مذہبی نظریے کے تحت ہوا جسے کہ اقتصادیات کہا جاتا ہے، اور یہ کوئی مذاق نہیں ہے، جو کہ ایسے مفروضوں پر مبنی ہے جن کی نہ تو کوئی نظریاتی (Theoretical) بنیادیں ہیں اور نہ ہی عملی تجربات پر مبنی کوئی ثبوت۔ تاہم ان میں اس لئے کشش پائی جاتی ہے کیونکہ اگر آپ ان مفروضوں یا نظریات کو اپنا لیں تو پھر انہیں ثابت بھی کر سکتے ہیں: مستعد منڈی کا مفروضہ، معقول توقعات کا مفروضہ، وغیرہ وغیرہ۔ ان تصورات کا پھیلاؤ، جو مرتکز دولت اور مراعات کے لئے بہت پرکشش ہے، اور یوں کامیاب بھی، مثالی نمونہ کے طور پر ایلن گرین پیسن کی صورت میں سامنے آیا، جو کم از کم یہ کہنے کی جرأت تو رکھتا تھا کہ یہ سب غلط تھا جب یہ نظام اپنی جگہ قائم نہ رہا۔ میرا انہیں خیال کہ کبھی کوئی ایسی عظیم الشان ذہنی و علمی ساخت اس طرح سے برباد ہوگئی ہو جیسے یہ نظام۔ ہوسکتا ہے کہ اس کی تاریخ میں کوئی مثال ہو، کم سے کم میرے ذہن میں تو نہیں آ رہی۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ اس کے کوئی اثرات نہیں پائے جائے۔ یہ بس جاری ہے۔ جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ طاقت کے لئے کارآمد ہے۔

ان تصورات کے اثرات کے تحت، قواعد وضوابط کے نظام کو ریگن، کلنٹن، اور بُش نے مُنہدم کر کے رکھ دیا۔ اس سارے عرصے کے دوران، مالیاتی بحران بار بار سر اُٹھاتے رہے ہیں، 1950 اور 1960 کے مستحکم عشروں کے برعکس۔ صدر ریگن کے دور حکومت میں بعض انتہائی سنجیدہ قسم کے بحران دیکھنے میں آئے۔ کلنٹن کے دور حکومت کے اختتام سے قبل ایک اور زبردست بحران دیکھنے میں آیا، ''ٹیک ببل'' یا ٹیکنالوجی کا غبارہ پھٹ جانے کی صورت میں۔ اس کے بعد وہ بحران جس میں سے ہم گذر رہے ہیں۔ ہر مرتبہ بد سے بدتر ہوتا ہوا بحران۔ نظام کو فوری طور پر از سر نو تعمیر کیا جا رہا ہے اور یوں اگلا بحران اور بھر بدتر ہونے کا امکان ہے۔ اس کی ایک وجہ، واحد وجہ نہیں، یہ سادہ سی حقیقت ہے کہ منڈی کے نظام میں آپ بیرونی عوامل کو پیش نظر ہی نہیں رکھتے اور یوں اس صورت میں نظام کو خطرات لاحق ہوجاتے ہیں۔

یہ مالیاتی بحرانوں کی صورت میں اتنا خطرناک یا مہلک نہیں ہوتا۔ ایک مالیاتی بحران دہشتناک ہوسکتا ہے، یہ لاکھوں کروڑوں لوگوں کو بے روزگار کر کے رکھ سکتا ہے، ان کی زندگیاں تباہ کر سکتا ہے۔ تاہم مالی بحران سے نکلا جا سکتا ہے۔ محصولات ادا کرنے والے مالدار لوگ آپ کی مدد کے لئے آگے بڑھ سکتے ہیں۔ عین یہی کچھ دیکھنے میں آیا۔ ہم نے اس کا آخری دو برسوں میں ڈرامائی طور پر مشاہدہ کیا۔ مالی نظام کمزور ہوگیا۔ حکومت اور خاص طور پر محصولات ادا کرنے والا متمول طبقہ آگے بڑھا اور لوگوں کو بحران سے باہر نکالا۔

ہم ماحولیاتی بحران کی طرف آتے ہیں۔ آپ کو مُشکل سے نکالنے والا کوئی بھی موجود نظر نہیں آ رہا۔ اس صورتحال میں خارجی عوامل انواع کے مقدر سے تعلق رکھتے ہیں۔ اگر انواع کی بقاء کے مسئلے کو منڈی کے نظام کی سرگرمیوں سے الگ تھلگ کر کے رکھ دیا جاتا ہے تو اردگرد کوئی بھی نہیں ہوتا جو آپ کو اس مسئلے سے نجات دلانے لگا ہو۔ یوں یہ ایک بیرونی عنصر پر مرتب ہونے والا مہلک اثر تھے۔ اور یہ حقیقت کہ یہ سب کچھ بغیر کسی اہم یا بامعنی اقدام یا اصلاح احوال کی کوشش کے جاری وساری ہے، اس امر کی نشاندہی کرتی ہے کہ ارسٹ میئر کے موقف میں واقعی وزن تھا۔ یوں نظر آتا ہے کہ ہمارے ساتھ کوئی ایسا مسئلہ ہے، ہماری ذہانت، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہم ایسے طریقوں سے کام کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں جو ایک محدود منظر نامے کو اندر تو معقولیت کے حامل لگتے ہیں، مگر طویل مدتی اہداف کے حوالے سے نامعقول نظر آتے ہیں، مثلاً کیا ہمیں اس بات کی فکر ہے کہ ہماری آئندہ نسلیں کس طرح کی دنیا میں زندگی گذاریں گی۔ اور اس صورتحال یا مسئلے کے حل کے لئے فوری طور پر کوئی خاص امکانات سامنے نظر نہیں آ رہے، خاص طور پر امریکہ میں۔ ہم دنیا کی سب سے بڑی طاقت ہیں اور ہمارا ہر فعل بہت اہمیت رکھتا ہے۔ تاہم اس حوالے سے ہماری ماضی کی کارکردگی بدترین رہی ہے۔

ایسے طریقے یا حکمت عملیاں ہیں جو کہ بروئے کار لائی جاسکتی ہیں۔ ان کی فہرست تیار کرنا مُشکل نہیں ہے۔ ایک اہم حل کیا جا سکتا ہے وہ کم درجے کی ٹیکنالوجی پر مبنی ہے۔ مثال کے طور پر گھروں کو موسم کے مطابق بنانا دوسری جنگ عظیم کے بعد کے دور میں بڑی تعداد میں عمارتیں تعمیر

www.MashalBooks.org

ہونے لگیں، جو ماحول کے نقطۂ نظر سے انتہائی نامعقول طریقے سے تعمیر ہو رہی تھیں۔ مگر ایک بار پھر منڈی کے نقطۂ نظر سے یہ سب کچھ معقول تھا۔ گھریلو عمارتوں کے نمونے موجود تھے، بڑی تعداد میں بنائے جانے والے گھروں کے لئے، جو کہ سارے ملک میں استعمال کئے گئے مختلف حالات کے مطابق۔ تو ہوسکتا ہے کہ ایریزونا میں سب کچھ ٹھیک لگے، مگر میساچوسٹس میں نہیں۔ یہ گھر اپنی جگہ موجود ہیں۔ یہ بہت زیادہ توانائی خرچ کرتے ہیں۔ ان کی اصلاح کی جاسکتی ہے۔ یہ بنیادی طور پر اندازِ تعمیر کا معاملہ ہے اس سے بہت فرق پڑے گا۔ اس کی بدولت بڑی زوال پذیر صنعتوں کی بحالی پر اثرات پڑیں گے، مثلاً تعمیراتی صنعت اور روزگار کے بحران پر بھی کافی حد تک قابو پایا جاسکے گا۔ اس کے لئے لوازمات (Inputs) درکار ہوں گے، پیسے درکار ہوں گے، اور آخر کار محصولات ادا کرنے والے طبقے کی مدد درکار ہوگی۔ ہم اسے حکومت کہتے ہیں، مگر اس کا مطلب ہے محصولات ادا کرنے والے۔ تاہم اس طریقے سے معیشت کو تحریک ملے گی، ملازمتوں میں اضافہ ہوگا، اور وہ بھی اچھے خاصے اضافی اثرات کے ساتھ (بینکار اور سرمایہ کار حضرات کو مالی لحاظ سے پُرکشش امدادی منصوبوں کی پیش کش کے برعکس)، اور اس کے ماحول پر منفی اثرات کے حوالے سے بھی خاطر خواہ نتائج برآمد ہوں گے۔ تاہم، اس حوالے سے بمشکل ہی کوئی تجویز نظر آتی ہے، تقریباً نہ ہونے کے برابر۔

ایک اور مثال، جو کہ امریکہ میں ایک طرح کا رسوا کن واقعہ ہے، اگر آپ نے کبھی بیرون ملک سفر کیا ہو تو آپ اس سے اچھی طرح آگاہ ہوں گے، جب آپ دنیا میں کسی بھی جگہ سفر کر کے امریکہ واپس آتے ہیں تو یوں لگتا ہے کہ آپ کسی تیسری دنیا کے پسماندہ ملک آرہے ہیں، بالکل ایسے۔ تحتی ڈھانچہ ٹوٹ پھوٹ رہا ہے، ذرائع مواصلات ناکارہ ہوچکے ہیں۔ ہم صرف ٹرینوں کی مثال ہی لیتے ہیں۔ جب میں 1950 کے لگ بھگ بوسٹن مُنتقل ہوگیا تو وہاں ایک ایسی ٹرین تھی جو بوسٹن سے نیویارک چلتی تھی۔ اس سفر میں چار گھنٹے لگتے تھے۔ اب وہاں بڑی تیزی سے چلنے والی ٹرین آگئی ہے جسے ''اسیلا'' کہتے ہیں، ایک زبردست ٹرین۔ یہ اپنا سفر تین گھنٹے اور چالیس منٹ میں طے کرتی ہے (اگر راستے میں کوئی خرابی نہ ہوجائے تو، اور ہو بھی نہیں سکتی، میرے علم

کے مطابق)۔ اگر آپ جاپان، جرمنی، یا چین میں ہوں، تقریباً کسی بھی جگہ، تو اتنا فاصلہ، ممکنہ طور پر تقریباً ڈیڑھ گھنٹے میں طے ہوگا، یا دو گھنٹے لے لے گا۔ اور یہ ایک عام سی بات ہے۔

ایسا حادثاتی طور پر نہیں ہوا۔ یہ ایک بہت بڑی سماجی اختراع/ صناعی کی منصوبہ بندی کا نتیجہ ہے جو کہ 1940 کی دہائی میں حکومت اور بڑے بڑے کاروباری اداروں کی طرف سے شروع کیا گیا تھا۔ یہ معاشرے کو ایک مخصوص سانچے میں ڈھالنے کی بڑی باضابطہ قسم کی کوشش تھی تاکہ ایندھن کے زیرِ زمین موجود قدرتی ذخائر (Fossil Fuels) کے استعمال کو زیادہ سے زیادہ فروغ دیا جائے۔ اس منصوبے کا ایک جزو یہ تھا کہ ایک اچھے خاصے مستعد ریلوے نظام کو ختم کر کے رکھ دیا جائے۔ نیوانگلینڈ میں، مثال کے طور پر، ایک انتہائی مناسب قسم کا مستعد برقی ریلوے کا نظام موجود تھا، جس کا جال پورے نیوانگلینڈ میں بچھا ہوا تھا۔ اگر آپ نے ای۔ ایل۔ ڈاکٹرو کا ناول ''ریگ ٹائم (Ragtime)'' پڑھا ہو تو اس کے پہلے باب میں بتایا گیا ہے کہ اس کا ہیرو ایک برقی ریل گاڑی پر بیٹھ کر نیوانگلینڈ میں سے گذر رہا ہوتا ہے۔ اس سارے نظام سے کاروں اور ٹرکوں کے حق میں چھٹکارا حاصل کرلیا گیا۔ لاس اینجلس میں، جو کہ اب ایک ڈراؤنی داستان بن چکا ہے، مجھے نہیں معلوم کہ آپ میں سے کسی کو کبھی وہاں جانے کا اتفاق ہوا ہے، ایک مستعد قسم کا عوامی برقی ٹرانسپورٹ کا نظام موجود تھا۔ اسے بھی تہس نہس کردیا گیا۔ اسے 1940 کے عشرے میں کیلیفورنیا کی سٹینڈرڈ آئل، فائرسٹون ربر، اور جنرل موٹرز نے خرید لیا تھا۔ ان کی طرف سے اس خرید کا مقصد یہ تھا کہ اس نظام کو تہس نہس کرکے رکھ دیا جائے تاکہ ٹرکوں، کاروں، اور بسوں سے ہر کام لیا جائے۔ اور ایسا ہی کیا گیا۔ یہ تکنیکی طور پر ایک سازش تھی۔ حقیقت میں انہیں اسی سازش کے الزام کے ساتھ عدالت میں لایا گیا اور پھر سزا دے دی گئی۔ میرے خیال میں سزا 5000 ڈالر جرمانے کی یا اسی طرح کی تھی جو کہ فاتحانہ ڈنر کے لئے کافی رقم تھی۔

وفاقی حکومت نے مداخلت کردی۔ ہمارے پاس ایک ایسی شے ہے جسے ''انٹرسٹیٹ ہائی وے سسٹم'' کہا جاتا ہے۔ جب 1950 کے عشرے میں اس کی تعمیر ہوئی تھی تو اسے ''نیشنل ڈیفنس ہائی وے سسٹم'' کا نام دیا گیا تھا کیونکہ آپ امریکہ میں جب بھی کوئی کام کرتے ہیں تو اسے

www.MashalBooks.org

ڈیفنس'' کہنا پڑتا ہے۔صرف یہی وہ طریقہ ہے کہ آپ شہریوں کو بیوقوف بنا کر محصولات وصول کر سکتے ہیں۔دراصل، 1950 کی دہائی میں ایسی داستانیں مشہور تھیں جو آپ میں سے عمر رسیدہ افراد کو یاد ہوں گی، اس (ہائی وے) کی ضرورت اجاگر کرنے کے حوالے سے کہ یہ اس لئے ضروری تھی تا کہ اگر روس امریکہ پر حملہ کر دے تو ملک کے اندر میزائلوں کو تیزی سے ایک سے دوسری جگہ لے جایا جا سکے۔یوں شہریوں کو دھوکہ دے کر اس (ہائی وے) سسٹم کے لئے محصولات کی شکل میں پیسے ادا کرنے پر مجبور کر دیا گیا۔اس کے ساتھ ہی ریلوے کے نظام کو بھی تباہ کر دیا گیا، یہی وجہ ہے کہ آپ کے پاس وہی کچھ ہے جس کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے۔وفاقی حکومت اور بڑے بڑے کاروباری اداروں کا پیسہ شاہراؤں، ہوائی اڈوں اور ہر اس شے پر جھونک دیا گیا جس سے ایندھن کا زیاں ہو۔یہ ایک بنیادی معیار رہے۔

اس کے علاوہ ملک کو نیم شہری (مضافاتی) علاقوں کا مجموعہ بنا کر رکھ دیا گیا۔زمین / جائیداد کے کاروبار سے متعلق مفادات، مقامی مفادات اور اسی طرح کے دیگر نجی مفادات ہی وہ محرکات تھے جو طرز زندگی کے تعین کے پس پردہ کام کر رہے تھے تا کہ لوگ الگ تھلگ اور نیم شہری طرز زندگی اختیار کر لیں۔میں مضافاتی علاقوں کی مذمت یا تنقید نہیں کر رہا، میں خود بھی ایک مضافاتی علاقے میں رہتا اور اسے پسند کرتا ہوں۔تاہم یہ نا قابل یقین حد تک بے نظمی کا شکار ہے۔یہ ہر اس طرح کے سماجی اثرات سے بھرپور ہے جو غالباً ضرر رساں ہیں۔بہرحال یہ سب کوئی اتفاقی نہیں ہے۔یہ سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ہوا ہے۔اس سارے عرصے کے دوران ممکنہ طور پر انتہائی تباہ کن معاشرہ ساخت کرنے کے لئے بڑے پیمانے پر کوششیں کی گئیں۔اور سماج کو اس طرح سے اختراع کرنے کے عظیم منصوبے کا رُخ الٹا کرنے کی کوشش کوئی آسان یا سادہ سا عمل ثابت نہیں ہونے لگی۔یہ بے شمار مسائل کا باعث بنے گی۔

کسی بھی معقول قسم کی حکمتِ عملی کا ایک اور جزو، اور ہر کوئی اس سے نظریے کی حد تک ضرور اتفاق کرتا ہے، توانائی کے ایک پائیدار وسیلے، سرسبز ٹیکنالوجی کو فروغ دینے سے متعلق ہے۔یہ ہم سب کو معلوم ہے اور ہر کوئی اس حوالے سے چند ایک عمدہ جملے بھی بول دیتا ہے۔تاہم آپ اگر

یہ دیکھیں کہ آپ کے اردگرد کیا ہو رہا ہے، تو پتہ چلے گا کہ سرسبز ٹیکنالوجی اسپین، جرمنی، اور بنیادی طور پر چین میں بھی فروغ دی جا رہی ہے۔جبکہ امریکہ میں یہ درآمد ہو رہی ہے۔دراصل، یہاں پر کافی نئے امکانات اجاگر ہو رہے ہیں، مگر ان کو عملی جامہ وہاں پہنایا جاتا ہے۔امریکی سرمایہ کار سرسبز ٹیکنالوجی پر جتنی سرمایہ کاری چین میں کر رہے ہیں وہ امریکہ اور یورپ میں کل سرمایہ کاری سے بھی زیادہ ہے۔اس وقت شکایات سامنے آئی تھیں جب ٹیکساس نے چین سے سولر پینل اور ہوا کی طاقت سے چلنے والی چکیاں (Windmills) منگوانے کا آرڈر دیا تھا: یہ سب ہماری صنعت کو کھوکھلا کر رہا ہے۔دراصل، یہ ہمیں کسی طرح بھی کھوکھلا کرنے والی صورتحال نہیں تھی کیونکہ ہم اس میدان سے ہی باہر تھے۔اس سے نقصان اسپین اور جرمن کو ہو رہا تھا، جو ہم سے بہت آگے تھے۔

صرف یہ اشارہ دینے کیلئے کہ یہ سب کتنا ماورائے حقیقت (surreal) ہے، اوباما حکومت نے گاڑیوں کی صنعت کا انتظام سنبھال لیا، یعنی کہ آپ کے ہاتھوں میں دے دیا۔اس کے لئے ادائیگی آپ نے کی، اس (صنعت) کو دیوالیہ ہونے سے آپ نے بچایا، اور بنیادی طور پر اس کے وسیع حِصّوں کے مالک بن گئے اور انہوں نے وہی کام جاری رکھا جو کارپوریشنیں کرتی چلی آ رہی تھیں، مثال کے طور پر جی۔ایم کے کارخانوں کی ہر جگہ بندش۔کسی کارخانے کو بند کرنے کا مطلب بنیادی طور پر صرف کارکنوں کا اخراج نہیں ہوتا، اس کا مطلب ایک سماجی طبقے کی تباہی بھی ہوتا ہے۔نام نہاد زنگی پٹی (Rust Belt) پر ہی ایک نظر ڈال کر دیکھیں، یعنی وہ خطہ جو کبھی منافع بخش صنعتوں کے حوالے سے مشہور تھا۔یہاں بستیاں کارکنوں کو منظم کر کے آباد کی گئی تھیں؛ یہ بستیاں کارخانوں کے گرد ہی بسائی گئی تھیں۔اب یہ گرا دی گئی ہیں۔اس کے وسیع تر اثرات سامنے آئے ہیں۔عین اس وقت جبکہ یہ کارخانے منہدم کئے جا رہے ہیں، اس کا مطلب یہی نکلتا ہے کہ آپ اور میں ہی انہیں گرا رہے ہیں، کیونکہ پیسے ہم سے ہی لئے گئے تھے اور یہ مُبینہ طور پر ہمارے نمائندے بھی ہیں، جبکہ حقیقت میں ایسا نہیں ہے، عین اسی وقت اوباما اپنے ٹرانسپورٹیشن سیکرٹری کو سپین بھیج رہا تھا تا کہ معیشت کو تحریک دینے کے لئے مختص پیسہ (Federal Stimulus Money) ہائی اسپیڈ ریل کے منصوبے کے حوالے سے معاہدے کے حصول پر خرچ کی جا سکے، جس کی ہمیں

اور دنیا کو واقعی ضرورت ہے۔ وہ کارخانے جو کہ ختم کئے جارہے ہیں اور ان میں کام کرنے والے کاریگر بھی ان کے ساتھ ہی، ان سب کو پھر سے ہائی اسپیڈ ریل کی صورت میں بحال کیا جاسکتا تھا۔ ان کے پاس ٹیکنالوجی ہے، علم ہے، مہارت ہے۔ تاہم یہ بینکوں کی بنیادی مالی حالت / معیار کیلئے اچھا نہیں ہے، اس لئے ہم یہ ٹیکنالوجی اسپین سے لیں گے۔ اور سرسز ٹیکنالوجی کی طرح، یہ کام بھی چین میں سرانجام دیا جائے گا۔

مسئلہ ترجیحات کا ہے؛ سب کچھ قوانین فطرت کا تقاضا نہیں ہے۔ تاہم، بدقسمتی سے انہی ترجیحات کو اہمیت دی جارہی ہے۔ اور کسی طرح کی مُثبت تبدیلی کے آثار بہت کم نظر آرہے ہیں۔ ہمیں بہت سے سنجیدہ نوعیت کے مسائل درپیش ہیں۔ یہ سب کچھ آسانی سے جاری رکھا جا سکتا ہے۔ تاہم میں مزید جاری نہیں رکھنا چاہتا۔ عمومی منظر، البتہ، کافی حد تک ایسا ہی ہے۔ میرا نہیں خیال کہ یہ کوئی نامنصفانہ انتخاب یا ترجیح ہے، یہ یقیناً ایک ترجیح ہے، مگر میرے خیال میں یہ واقع ہونے والی صورتحال کا معقول حد تک مناسب انتخاب ہے۔ نتائج اچھے خاصے خوفناک نظر آرہے ہیں۔

اس میں ذرائع ابلاغ کا بھی کردار ہوتا ہے۔ اس لئے اگر آپ، کیا کہتے ہیں، نیو یارک ٹائمز میں کوئی روایتی قسم کا تجزیہ (Story) پڑھتے ہیں، تو اس میں بتایا جائے گا کہ عالمی حدّت کے حوالے سے ایک مباحثہ جاری ہے۔ اگر آپ اس مباحثے پر نظر ڈالیں گے تو ہوسکتا ہے ایک طرف دنیا کے 98 فی صد متعلقہ سائنسدان ہوں، اور دوسری سمت ایک دو ایسے سنجیدہ قسم کے سائنسدان جنہیں اس پر اعتراض ہو، تھوڑے سے سائنسدان، اور ان کے ساتھ جم انہوف اور چند ایک سینیٹر حضرات۔

چنانچہ یہ ایک مباحثہ ہی ہے۔ اور عام شہری کو دونوں اطراف میں سے کسی ایک کے حق میں فیصلہ کرنا ہوگا۔ ''ٹائمز'' میں ایک مضحکہ خیز قسم کا مضمون صفحہ اوّل کی زینت بنا تھا، شاید کوئی دو ماہ قبل، جس کی شہہ سُرخی کے مطابق محکمہ موسمیات کے ماہرین والوں نے عالمی حدّت کے حوالے سے کچھ شکوک کا اظہار کیا تھا۔ اس میں ماہرین موسمیات کے درمیان ہونے والے مباحثے پر

تبادلہ خیال کیا گیا تھا۔ یہ (ماہرین موسمیات) وہ لوگ ہوتے ہیں جو کسی کی طرف سے تھمائے گئے کاغذ کو ٹیلی وژن پر پڑھ لیتے ہیں اور جس پر لکھا ہوتا ہے کہ کل بارش ہوگی۔ یہ مباحثے کا یکطرفہ پہلو ہے۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ عملی طور پر ہر سائنسدان کو اس حوالے سے کچھ نہ کچھ علم ہوتا ہے۔ ایک مرتبہ پھر فیصلہ شہری کے ہاتھوں میں ہی ہوتا ہے۔ کیا میں ان ماہرین موسمیات پر اعتبار کرسکتا ہوں؟ یہ مجھے بتاتے ہیں کہ آیا مجھے کل برساتی پہننی ہوگی؟ اور کیا مجھے سائنسدانوں کے بارے میں بھی کچھ علم ہے؟ وہ کہیں کسی تجربہ گاہ میں بیٹھے ہوئے ہیں کسی کمپیوٹر کے آگے۔ تو یہ درست ہے کہ لوگ اُلجھن کا شکار ہیں، اور قابل فہم طور پر۔

یہ امر دِلچسپ ہے کہ یہ مباحثے اس حوالے سے بحث کا تقریباً تقریباً تیسرا حِصّہ بالکل ہی نظر انداز کر دیتے ہیں، یعنی، سائنس دانوں کی اچھی خاصی تعداد، اہلیت رکھنے والے سائنسدانوں کی، جو یہ سمجھتے ہیں کہ سائنسی اتفاق رائے کافی حد تک رجائیت پسندی کا حامل ہے۔ ایم آئی ٹی میں سائنسدانوں کی ایک جماعت نے کوئی ایک برس قبل رپورٹ پیش کرتے ہوئے اس شے کو بیان کیا تھا جو کہ ان کے مطابق موسم / آب وہوا کا انتہائی جامع قسم کا ایسا نمونہ تھا جو اس سے قبل شاید ہی منظرِ عام پر آیا ہو۔ انہوں نے جو نتیجہ اخذ کیا تھا، جس کا عوامی ذرائع ابلاغ میں ذکر نہیں کیا گیا جہاں تک میرا علم ہے، وہ یہ تھا کہ بین الاقوامی کمیشن کا سائنسی حوالے سے اہم اتفاق رائے بعض ایک دور کی بات ہے، یہ بہت ہی زیادہ رجائیت پسندانہ ہے؛ اور آپ اگر دوسرے عوامل کو بھی شامل کریں جو کہ انہوں نے مناسب طریقے سے شمار نہیں کئے تو نتیجہ بہت ہی ہولناک نکلتا ہے۔ ان کا اپنا اخذ کردہ نتیجہ یہ تھا کہ ہم جب تک زیر زمین ایندھن کا استعمال تقریباً فوری طور پر ترک نہیں کر دیتے، تو سب کچھ ختم۔ ہم کبھی بھی نتائج پر قابو پانے کے قابل نہیں ہوں گے۔ یہ مباحثے کا حصہ نہیں ہے۔

میں بات آسانی سے آگے بڑھا سکتا تھا، تاہم اس سارے مباحثے کو ممکنہ طور پر جو واحد شے متوازن رنگ عطا کرسکتی ہے وہ ایک طرح کی ایسی اچھی خاصی مقبول تحریک ہوسکتی ہے جو نہ صرف اس امر کا مطالبہ کرے کہ چھتوں کے اوپر سولر پینل نصب کئے جائیں، جو کہ ایک اچھی چیز

ہے، بلکہ یہ اس ساری کی ساری معاشرتی ،ثقافتی ،اقتصادی ،اورنظریاتی ساخت کوبھی منہدم کر کے رکھ دے جو ہمیں تباہی کی سمت لے جارہی ہے۔ یہ کوئی معمولی کام نہیں ہے، تاہم یہ ایسا کام ہے جو بہتر ہے کہ شروع کر دیا جائے، اور غالباً تیزی سے، وگرنہ بہت تاخیر ہو جائے گی۔

سوال وجواب

ان کارپوریشنوں کی گرفت کو کمزور کرنے کے لئے کسی طرح کے سیاسی عمل کی ضرورت ہے جو حالات کی یکسانیت یا جمود سے فائدہ اُٹھاتی ہیں اور قواعد وضوابط کے ساتھ ہی تبدیلی کی بھی مزاحمت کرتی ہیں؟

یہ ایک ایسا سوال ہے جو موسمیاتی تبدیلی کے موضوع سے بھی آگے چلا جاتا ہے۔ یہ ایسے انتہائی سنجیدہ قسم کے مسائل کے ایک پورے سلسلے کا بھی احاطہ کرتا ہے جو اتنے مہلک تو نہیں ہیں جتنا کہ ماحولیاتی بحران، تاہم پھر بھی سنجیدہ نوعیت کے ہیں، جیسے، مثال کے طور پر، مالیاتی بحران، جو محض مالیاتی ہی نہیں ہے بلکہ اقتصادی بحران ہے۔ کروڑوں لوگ بیروزگار پھر رہے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ انہیں دوبارہ ملازمت نہ مل سکے۔ اصل حقیقت تو یہ ہے کہ امریکہ دوسرے صنعتی ممالک سے اتنا مختلف تو نہیں ہے، تاہم کسی حد تک مختلف ضرور ہے۔

یورپ، مثال کے طور پر، ایک جاگیرداری نظام سے نکل کر پروان چڑھا۔ جاگیرداری نظاموں میں ہر ایک کے لئے جگہ ہوتی تھی، ہوسکتا ہے کہ نامناسب قسم کی (lousy) جگہ، مگر کوئی نہ کوئی جگہ ضرور ہوتی تھی۔ اور معاشرہ اس مقام کی ضمانت دیتا تھا۔ امریکہ کا آغاز ایک خالی صفحے (Blank Slate) کے طور پر ہوا۔ مقامی باشندوں کا خاتمہ کر دیا گیا، ایک معمولی سی حقیقت جس کے بارے میں ہم سوچنا بھی پسند نہیں کرتے۔ نقل مکانی کرنے والے آپہنچے۔ ملک اقتصادی لحاظ سے بہت برتر حیثیت رکھتا تھا۔ حکومت نے معاشرے کی ترقی کے عمل میں بڑے پیمانے پر معاونت کی۔ کئے جانے والے دعوے کے برعکس، ہمارے یہاں معیشت میں ریاست کی جانب سے ہمیشہ ہی خاص مداخلت کی جاتی رہی۔ اور جو چیز ظہور میں آئی وہ ایک کاروباری محرک کا حامل معاشرہ تھا، کافی غیر معمولی حد تک۔ یہ تمام زاویوں سے نمایاں ہونے والا عنصر ہے، اس حقیقت کی

طرح کہ ہم تقریباً واحد صنعتی معاشرہ ہیں، ہوسکتا ہے کہ صرف ہم ہی جن کے پاس کسی طرح کا نیم معقول صحت کا نظام بھی نہیں ہے، اور یہ کہ فوائد / سہولیات عمومی حوالے سے خاصی کمزور ہیں بہ نسبت دیگر صنعتی معاشروں کے۔ محنت کشوں کی حالت کمزور ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے۔ ہر قسم کی پیشرفت، اجتماعی مظاہرے وغیرہ دیکھنے میں آئے ہیں۔ تبدیلیاں، بہت سی ترقی، اکثر اوقات تنزلی۔ تاہم یہ ابھی تک ایک ایسا معاشرہ چلا آرہا ہے جو کافی حد تک مرتکز کاروباری شعبے کی گرفت میں ہے۔ گذشتہ برسوں میں اس شعبے میں بہت زیادہ پھیلاؤ دیکھنے میں آیا ہے۔ یہ عین ہماری آنکھوں کے سامنے ہی پھیلتا چلا جارہا ہے، اس لئے، مثال کے طور پر، سٹیزن یونائیٹڈ کا سپریم کورٹ کا فیصلہ جمہوریت کے لئے ایک اور عظیم دھچکہ ہے، اور اسے اسی مفہوم میں ہی لینا چاہیے۔

چنانچہ اب ہم اس کے حوالے سے کیا کر سکتے ہیں؟ ماضی میں کیا کیا گیا ہے؟ یہ کوئی قوانین قدرت نہیں ہیں۔ ''نیوڈیل'' نے بھی کافی نقصان پہنچایا، واضح طور پر، تاہم یہ اس وجہ سے نہیں ہوا کہ روزویلٹ ایک اچھا آدمی تھا۔ ایسا اس لئے ہوا کیونکہ کئی برسوں کی شدید اذیت کے بعد، اب سے بھی بدتر، کساد بازاری کے کوئی پانچ یا چھ برسوں کے بعد، اچھی خاصی تنظیم اور تحریک دیکھنے میں آئی تھی۔ سی آئی او (C10) کی تشکیل کی گئی، دھرنے کی صورت میں احتجاجی تحریکیں شروع ہو رہی تھیں۔ دھرنے کی صورت میں مظاہرے انتظامیہ کے لئے دہشتناک ہوتے ہیں، کیونکہ یہ اصل مقصد سے صرف ایک قدم پیچھے ہوتے ہیں، یعنی اس کے بعد کارکن کارخانے پر قبضہ کر کے انتظامیہ کو باہر نکال پھینکیں گے۔ اگر آپ اس وقت کے کاروباری اخبارات ورسائل وجرائد پر دوبارہ نظر ڈالیں تو وہ لوگ واقعی اس بات سے دہشت زدہ تھے جو کہ ان کے نزدیک صنعت کاروں کے لئے خطرے کی علامت اور عوام کی روز افزوں بڑھتی ہوئی طاقت تھی وغیرہ وغیرہ۔

اس کا ایک نتیجہ یہ برآمد ہوا ''نیوڈیل'' کے تحت اقدامات کو رسمی شکل میں نافذ کر دیا گیا جو کہ موثر ثابت ہوئے۔ اب میری عمر اتنی ہوگئی ہے کہ مجھے کچھ یاد نہیں آرہا۔ میرے خاندان کے زیادہ تر افراد مزدور طبقے سے تعلق رکھنے والے بیروزگار لوگ تھے۔ اور اس چیز کا خاطر خواہ اثر ہوا، جیسا کہ میں نے بیان کیا ہے، دیرپا اثر۔ اس کے نتیجے میں امریکی تاریخ کی عظیم ترین افزائش کا

www.MashalBooks.org

دور شروع ہوا، بلکہ غالباً عالمی تاریخ کا بھی، وسیع تر افزائش اور مساویانہ ثمرات کی حامل افزائش۔ بعد ازاں اس میں تنزلی آنے لگی، اور سب کچھ نیچے کی طرف جانا شروع ہو گیا۔ صورتحال اب یکسر بدل کر رہ گئی ہے۔ 1960 کا عشرہ ایک اور مثالی دور تھا جب مستحکم عوامی سرگرمی ایسی ولولہ انگیز طاقت تھی جس کا نتیجہ ''جانسن کی اصلاحات'' کی صورت میں برآمد ہو۔ ان اصلاحات کی بدولت سماجی اور اقتصادی نظام میں محدود قسم کی تبدیلی نہیں آئی جو کہ ''نیوڈیل'' کا نتیجہ تھی، بلکہ ان کے اثرات اس وقت بھی وسیع تر مرتب ہوئے جو کئی برس تک نمایاں ہے: شہری حقوق، حقوق نسواں، ہم جنس پرستوں کے حقوق، ہر طرح کے حقوق۔ تبدیلی کا یہی واحد طریقہ ہے۔ اگر کسی کے پاس کوئی نئی تجویز ہے تو سن کر خوشی ہو گی، تاہم یہ دو ہزار برسوں سے ایک راز ہی ہے۔

کیا ہم عالمی حدّت کی راہ پر اس مقام سے کہیں آگے نکل گئے ہیں جہاں تک کہ سائنسدانوں کے لئے سیاسی طور پر کچھ کہنا ممکن ہے؟

سائنس کے میدان میں آپ کو ہمیشہ کچھ ایسے لوگ بھی مل جائیں گے جو کہ سطحی قسم کا علم رکھتے ہیں، ہو سکتا ہے کہ ان کی دلیلیں بڑی اچھی ہوں مگر سطحی قسم کی۔ تاہم سائنسدانوں کی غالب اکثریت کا بنیادی حقیقت پر اچھا خاصا اتفاق پایا جاتا ہے: یہ کہ مسئلہ بہت گمبھیر ہے جس کی شدّت میں اور بھی اضافہ ہونے لگا ہے اور ہمیں اس حوالے سے کچھ کرنا پڑے گا۔ اس حوالے سے اختلافات موجود ہیں۔ اہم اختلاف عالمی سطح پر بنیادی اتفاق رائے رکھنے والے سائنسدانوں اور ان لوگوں کے درمیان ہے جو یہ کہتے ہیں کہ اس میں زیادہ شدّت نہیں آنے لگی، یہ خطرناک حد سے ابھی کافی دور ہے۔ لہٰذا مثال کے طور پر، یہ تحقیق جس کا میں نے ذکر کیا ہے، جو کہ اہم تنقیدی کاوشوں میں سے ایک ہے، یہ کہتی ہے کہ اس حوالے سے کچھ زیادہ ہی خوش فہمی پائی جاتی ہے، وہ اس نکتے پر زور دیتے ہیں کہ وہ ایسے عوامل کو پیش نظر نہیں رکھتے جو صورتحال کو بدتر بنا کر رکھ دیں۔ مثال کے طور پر، ان کے تیار کردہ نمونوں میں طویل عرصہ سے منجمد برفوں کے پگھلنے جیسے عناصر کو نظر انداز کر دیا گیا، جس کا آغاز اب ہو رہا ہے۔ اور یہ بات خاصی قابل فہم ہے کہ اس کے نتیجے میں میتھین گیس کافی مقدار میں خارج ہو گی، جو ماحول کے لئے کاربن ڈائی آکسائیڈ سے بھی بڑھ کر ضرر رساں ہے،

اور یوں صورتحال بڑے پیمانے پر ابتری کا شکار ہو سکتی ہے۔ بہت سے مراحل عمل کو جن پر تحقیق کی گئی ہے ناہموار خاصیت کا حامل (Nonlinear) کہا جاتا ہے، یعنی کہ ایک چھوٹی سی تبدیلی بڑے پیمانے کے اثرات پیدا کر سکتی ہے اور تقریباً سارے ہی اشارے غلط سمت میں جا رہے ہیں۔ لہٰذا میرے خیال میں جواب یہ ہے کہ سائنسدان ہر شے کی تفصیلات بیان نہیں کر سکتے، تاہم وہ قائل کرنے کی حد تک یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک بُری خبر ہے۔

فلسفہ دان ماحولیاتی ذمہ داری کا احساس یا شعور بڑھانے میں کیا کردار ادا کر سکتے ہیں؟

کافی حد تک اسی انداز میں جس طرح جیومیٹری کے ذریعے خاکہ کشی کرنے والے (Algebraic Topologist) کرتے ہیں۔ اگر آپ فلسفہ دان ہیں تو پھر بھی آپ بنیادی طور پر انسان ہی رہتے ہیں۔ یہ انسانی مسائل ہیں۔ فلسفہ دان، کسی بھی اور فرد کی طرح، جیسے جیومیٹری کے خاکے بنانے والے، ترکھان وغیرہ، ان کے حل میں اپنا کردار ادا کر سکتے ہیں۔ ہماری طرح کے لوگ مراعات یافتہ ہیں۔ ہمیں بہت سی مراعات ملی ہوئی ہیں۔ اگر آپ کسی تعلیمی شعبے کی شخصیت ہیں تو آپ کو اچھا خاصا معاوضہ ادا کیا جاتا ہے، آپ کے سامنے بہت سی ترجیحات ہوتی ہیں، آپ تحقیق کا کام کر سکتے ہیں، آپ کے پاس ایک قسم کا پلیٹ فارم یا محاذ ہوتا ہے۔ آپ اسے استعمال کر سکتے ہیں۔ یہ بالکل سیدھا سادہ معاملہ ہے۔ اس میں کوئی ایسے فلسفیانہ مسائل نہیں ہیں جو مجھے نظر آ سکتے ہوں۔ یہ ایک اخلاقی (ضوابط کا) مسئلہ ہے، مگر ایسا جو اس قدر واضح یا عیاں ہے کہ آپ کو اس کے لئے کسی پیچیدہ قسم کے فلسفے کی ضرورت نہیں ہے۔

انسانوں کے ساتھ ہی خوراک کی پیداوار کے عمل میں بھی تنوع حیات کا توازن (Ecological Stability) قائم رکھنے کے لئے کس طرح اصلاحات لائی جا سکتی ہیں؟ کیا زراعت ہمارے سیارے کے لئے تباہ کن خاصیت کی حامل ہے؟

اگر زراعت اپنی فطری خاصیت کے لحاظ سے تباہ کُن ہے تو پھر ہم بھی ایک دوسرے کو خدا حافظ کہہ سکتے ہیں، کیونکہ ہم جو کچھ بھی کھاتے ہیں وہ زرعی شعبے سے آتا ہے۔ چاہے وہ گوشت ہو یا دودھ یا

www.MashalBooks.org

کوئی بھی شے۔ اس امر پر یقین کرنے کی کوئی خاص وجہ نہیں ہے کہ یہ فطری طور پر تباہ کن ہوتی ہے۔ اصل میں یہ زراعت کی شکلیں ہیں جو کہ تباہ کن ہیں: بہت زیادہ توانائی والے لوازمات (High-energy inputs)، بہت زیادہ کھاد کا استعمال۔ یہ چیزیں سستی لگتی ہیں، تاہم اگر آپ ان کے ساتھ ان تمام منفی اثرات کو بھی مدّنظر رکھیں جو نتیجے کے طور پر سامنے آتے ہیں تو پھر یہ سستی نہیں ہیں۔ اگر آپ ماحولیاتی تباہی کے عنصر کو بھی سامنے رکھیں جو کہ اضافی لاگت کی طرح ہے تو پھر یہ کسی طرح بھی سستی نہیں ہیں۔ لہٰذا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا زرعی نظام کو فروغ دینے کے اور طریقے بھی موجود ہیں جو بنیادی طور پر پائیدار و مستحکم ہوں گے؟ یہ توانائی کی طرح کے ہوں گے۔ اس امر کی کوئی معلوم وجوہات نہیں ملتیں کہ ایسا ناممکن کیوں ہے۔ اس حوالے سے بے شمار تجاویز موجود ہیں کہ ایسا کس طرح ہو سکتا ہے۔ تاہم، ایک مرتبہ پھر، اس کے لئے ساری کی ساری اقتصادی، سماجی، ثقافتی، اور دیگر ساختوں کو مُنہدم کر دینا پڑے گا، جو کوئی آسان کام نہیں ہے۔ یہی مسئلہ سر سبز ٹیکنالوجی کے ساتھ ہے۔ مجھے سر سبز ٹیکنالوجی کے مسئلے کے لئے کوئی اور لفظ استعمال کرنا چاہیے، جو ایک بار پھر، بنیادی طور پر نظریاتی قسم کا ہے۔ اگر آپ اس سے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے اس پر نگاہ ڈالیں، جب لوگ یہ نکتہ اُٹھاتے ہیں، جیسا کہ وہ کرتے ہیں، کہ سر سبز ٹیکنالوجی کو چین میں فروغ دیا جا رہا ہے مگر یہاں نہیں، تو اس کی جو ایک روایتی وجہ بیان کی جاتی ہے وہ یہ ہوتی ہے کہ چین ایک مطلق العنان ملک ہے، اس لئے وہاں حکومت پیداواری طریقوں کو اپنی گرفت میں رکھتی ہے۔ یہاں پر وہ چیز ہے جسے ہم صنعتی پالیسی کہتے ہیں: حکومت منڈی کے نظام میں مداخلت کرتی ہے، اس امر کا تعین کرنے کے لئے کہ کیا پیدا کرنا ہے اور کس طرح پیدا کرنا ہے اور پھر اس حوالے سے شرائط و ضوابط متعین کرنے کے لئے اور ٹیکنالوجی مُنتقل کرنے کے شرائط کا تعین کرنے کے لئے۔ اور وہ یہ سب کچھ عوام سے رائے لئے بغیر کرتے ہیں، یوں وہ ایسے ضوابط لاگو کر سکتے یا ایسا ماحول پیدا کر سکتے ہیں جو سرمایہ کاروں کو وہاں سرمایہ کاری کی ترغیب دے گا نہ کہ یہاں۔ ہم جمہوریت اور آزادی پسند لوگ ہیں اور اس طرح کے کام نہیں کرتے۔ ہم منڈی کے نظام اور جمہوریت میں یقین رکھتے ہیں۔

یہ بالکل ہی فرسودہ اور غلط بات ہے امریکہ میں بھی ایک انتہائی اہم صنعتی پالیسی موجود ہے اور یہ انتہائی غیر جمہوری قسم کی ہے۔ یہ ایسی ہے کہ ہم اسے پالیسی نہیں کہتے۔ اس لئے، مثال کے طور پر، اگر آپ کوئی کمپیوٹر استعمال کرتے ہیں یا انٹرنیٹ استعمال کرتے ہیں یا پھر بذریعہ جہاز سفر کرتے ہیں یا وال مارٹ سے کوئی خریداری کرتے ہیں جو کہ تجارت پر مبنی ہوتی ہے، جو کہ ایسے بڑے ڈبوں (Containers) کے ذریعے ہوتی ہے جو امریکی بحریہ کے تیار کردہ ہوں، تو آپ قدم قدم پر بڑے پیمانے کی صنعتی پالیسی، ریاست کے آغاز کردہ پروگرام سے مستفید ہو رہے ہوتے ہیں۔ یہ ایک طرح سے بین الریاستی شاہراہوں پر رواں دواں ہونے کی طرح ہے۔ ریاست کی طرف سے شروع کردہ پروگرام جہاں تقریباً ساری کی ساری تحقیق و ترقی اور خریداری کا کام، جو کہ کارپوریشنوں کو اعانت فراہم کرنے میں ایک عنصر کی حیثیت رکھتا ہے، یہ سب کچھ کئی عشروں تک ہوتا رہا قبل اس کے کہ کوئی شے منڈی تک پہنچ سکے۔

مثال کے طور پر، کمپیوٹر کو ہی لے لیں۔ پہلے پہل کمپیوٹر 1952 میں منظر عام پر آئے تھے، مگر عملی لحاظ سے ان کا حجم ایک کمرے کے برابر تھا، بمعہ دھماکہ کرتی ہوئی نلکیوں اور ہر طرف بکھرے ہوئے کاغذوں کے۔ جب یہ سب ہو رہا تھا تو میں اس وقت ایم آئی ٹی میں تھا۔ آپ ان کو استعمال نہیں کر سکتے تھے۔ ان کے لئے مالیاتی وسائل حکومت کی طرف سے، زیادہ تر پنٹاگون کی طرف سے، بلکہ تقریباً سارے کے سارے ہی ان کی طرف سے فراہم کئے گئے تھے۔ 1950 کی دہائی کے دوران، ان کے حجم میں کمی کرنا ممکن ہو گیا اور آپ بھی ایک کمپیوٹر حاصل کر سکتے تھے جو فائلوں کی الماریوں کے ایک مجموعے کی طرح نظر آتا تھا۔ لنکن لیبز سے، جو کہ ایم آئی ٹی کی ایک ایسی لیب تھی جو ترقی کے مراکز میں سے ایک تھی، بعض بڑے بڑے انجینئر نکل گئے اور اُنہوں نے اولین نجی کمپیوٹر کمپنی ڈی ای سی (DEC) کی تشکیل کر ڈالی جو کافی عرصے تک ایک بڑی کمپنی کے طور پر قائم رہی۔ اس دوران آئی بی ایم بھی میدان میں آ گئی، یہ سیکھتے ہوئے کہ ''پنچ کارڈز'' کی جگہ کس طرح برقی کمپیوٹر متعارف کرائے جائیں، عام شہری کے خرچے پر (محصولات کی صورت میں)، اور وہ اس قابل ہو گئے کہ ایک بڑا کمپیوٹر ساخت کر سکیں، دنیا کا اوّلین تیز ترین کمپیوٹر،

www.MashalBooks.org

1960 کی دہائی کے آغاز میں۔ تاہم یہ کمپیوٹر کوئی بھی نہیں خرید سکتا تھا۔ یہ بہت مہنگے کمپیوٹر تھے۔ چنانچہ یہ حکومت نے خریدے، یعنی آپ نے۔ بڑے بڑے کاروباری اداروں کو دی جانے والی اعانت کا ایک اہم طریقہ ان کی مصنوعات خرید لینا ہے۔ دراصل، میرے خیال میں پہلا کمپیوٹر جو بازار میں فروخت کے لئے پیش کیا گیا وہ غالباً 1978 کے قریب کی بات ہے۔ یعنی کمپیوٹر کی اختراع کے کوئی 25 برس کے بعد۔ انٹرنیٹ کی بھی یہی داستان ہے اور پھر بل گیٹس امیر ہوجاتا ہے۔ تاہم بنیادی کام پینٹا گون کے سائے تلے حکومتی تعاون سے کیا گیا۔ یہی کچھ بہت سی اور چیزوں، تقریباً تقریباً انفارمیشن ٹیکنالوجی (آئی ٹی) کے سارے شعبے کے ساتھ کیا گیا۔ انٹرنیٹ نجی شعبے کے سپرد کئے جانے سے قبل کوئی تیس برس سرکاری تحویل میں رہا ہے۔

تو یہ ہے صنعتی پالیسی۔ ہم اسے صنعتی پالیسی نہیں کہتے۔ کیا یہ جمہوری تھی؟ چین سے زیادہ نہیں۔ 1950 کے عشرے میں عوام سے یہ نہیں پوچھا گیا کہ "کیا آپ چاہتے ہیں کہ آپ کی طرف سے محصولات کی صورت میں ملنے والی رقم کو کمپیوٹر بنانے پر صرف کر دیا جائے تاکہ ہوسکتا ہے اس طرح آپ کے پوتے کے ہاتھ میں کبھی آئی پاڈ (ipod) آجائے، یا پھر کیا اس رقم کو صحت تعلیم اور سماجی طبقوں کی زندگیاں معیاری بنانے کے لئے خرچ کیا جائے؟" کسی سے بھی یہ سوال نہیں کیا گیا تھا۔ انہیں جو بتایا گیا تھا وہ یہ تھا: "روسی آرہے ہیں، اس لئے ہمیں بہت بڑا فوجی بجٹ درکار ہے۔ لہٰذا ہمیں پیسہ ادھر لگانا ہوگا۔ اور ہوسکتا ہے کہ آپ کے پوتے کے پاس کبھی آئی پاڈ آجائے۔" یہ اتنا جمہوری ہے جتنا کہ چینی نظام ہے، اور یہ بہت پرانی بات ہے۔ ہم اسے یہ نام نہیں دیتے۔ یہ سب غیر جمہوری انداز میں نہیں کرنا چاہیے، تاہم اسے جمہوری انداز میں کرنے کے لئے ثقافتی تبدیلیوں اور فہم وفراست کی ضرورت ہے۔ کمپیوٹر کے حوالے سے ہوسکتا ہے کہ یہ غلط فیصلہ ہو۔ ہوسکتا ہے انہیں اور کام کرنے کی ضرورت تھی، زندگی کا معیار اور بہتر کرنے کی۔ ہوسکتا ہے کہ یہ درست فیصلہ ہو۔ تاہم سرسبز ٹیکنالوجی اور توانائی کے پائیدار وسائل جیسے معاملات کے حوالے سے میرا نہیں خیال کہ درست فیصلے کے بارے میں کسی قسم کے ابہام کی گنجائش ہے اگر آپ لوگوں کو اس کی وضاحت کرنے اور تسلیم کرنے پر آمادہ کرلیں تو۔ اور اس راستے میں بہت

بڑی رکاوٹیں ہیں جیسی کہ میں نے بیان کی ہیں۔

آپ امریکہ میں امدادِ باہمی کی انجمنوں اور مقامی سطح پر بنیاد رکھنے والے دیگر اداروں کا کیا کردار دیکھتے ہیں، بہ نسبت دیگر ممالک کے، مثلاً ارجنٹینا؟

میرے خیال میں یہ ایک مُثبت پیش رفت ہے۔ یہ بنیادی قسم کی ہے۔ ارجنٹینا میں چند ایک ایسے ادارے ہیں جو بحران کے بعد پروان چڑھے تھے۔ یہ شدید بحران سے دوچار تھے۔ ارجنٹینا میں جو کچھ ہوا وہ یہ تھا کہ چالیس برس تک ارجنٹینا نے آئی ایم ایف (انٹرنیشنل مانیٹری فنڈ) کے مشوروں کی پیروی کی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ آئی ایم ایف کی تشہیر کا سامان بن گئے تھے۔ وہ سب کچھ درست کر رہے تھے۔ اور یہ سب کچھ مسمار ہو کر رہ گیا، جیسا کہ تقریباً ہمیشہ ہی ہوتا ہے۔ اس مرحلے پر، کوئی دس برس قبل ارجنٹینا نے آئی ایم ایف اور معیشت دانوں کے مشوروں کو مسترد کر کے رکھ دیا، مکمل طور پر، ان کی خلاف ورزی کر ڈالی، اور پھر بہت ہی کامیاب اقتصادی ترقی کے عمل کا آغاز ہوگیا، غالباً جنوبی امریکہ میں بہترین۔ تاہم اس بحران کے اندر سے امداد باہمی کی انجمنوں نے جنم لیا، جن میں سے بعض برقرار چلی آرہی ہیں اور کارکنوں کی طرف سے چلائی جانے والی قابل عمل انجمنوں کی صورت میں قائم ہیں۔ کچھ ایسی انجمنیں امریکہ میں بھی ہیں، اس سے کہیں زیادہ جتنا آپ کا خیال ہے۔ اس موضوع پر ایک کتاب بھی لکھی جاچکی ہے، اگر آپ کو اس میں دلچسپی ہو تو، جو کہ ایک ایسے سرگرم کارکن کی کاوش ہے جو اس تحریک سے منسلک ہے۔ اس کا نام ہے گار الپیر ووز (Gar Alperovitz)۔ اس نے بہت سی ایسی پیش قدمیوں کا جائزہ لیا ہے جن کا آغاز کیا جاچکا ہے، اور حیرت انگیز طور پر انکی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی بہت بڑے پیمانے پر موجود نہیں ہے، مگر وجود ضرور رکھتی ہیں۔

اب ہم پھر اس مثال کی طرف آتے ہیں جو میں نے بیان کی ہے، جی۔ ایم کے کارخانوں کی بندش کی اور اسپین میں معاہدوں کے حصول کی۔ ایک چیز جو واقع ہوسکتی تھی، وہ یہ تھی کہ ان کارخانوں میں کام کرنے والے محنت کش کارخانوں پر قبضہ کر لیتے اور کہتے، ٹھیک ہے، ہم تعمیر کرنے اور پروان چڑھانے کا کام کرنے لگے ہیں، ہم انہیں کسی اور مقصد کے لئے استعمال کرنے لگے ہیں، ہم تیز رفتار ٹرین چلائیں گے، جس کی کہ وہ (محنت کش) استطاعت بھی رکھتے ہیں۔

www.MashalBooks.org

انہیں مدد کی ضرورت ہوتی: انہیں بستی والوں کی مدد درکار ہوتی اور دیگر لوگوں کی بھی۔ تاہم ایسا ہو سکتا تھا۔ اس صورت میں مقامی لوگ اور صنعت تباہی کا شکار نہ ہوتے۔ بینک والے اتنا پیسہ نہ کماتے، تاہم ہمارے پاس اپنی بنائی ہوئی تیز رفتار ٹرین ہوتی۔ یہ ساری چیزیں ممکن ہیں۔

دراصل، بعض اوقات یہ لوگ مقصد کے بہت قریب بھی پہنچ چکے ہوتے تھے۔ 1980 کے قریب یو۔ ایس۔ اسٹیل، ینگز ٹاؤن، اوہیو میں اپنے بڑے کارخانے بند کرنے لگی تھی۔ وہ ایک قسم کا اسٹیل ٹاؤن بن چکا تھا۔ یہ ایک طرح سے اسٹیل کی صنعت کی بدولت منظر عام پر آیا تھا، تاہم یہ اس وقت جس کسی کی بھی ملکیت تھا اُس نے یہ تخمینہ لگایا کہ اگر وہ اسے تباہ و برباد کر دے تو یہ عمل زیادہ منافع بخش رہے گا۔ بڑے پیمانے پر احتجاجی مظاہرے ہونے لگے، ہڑتالیں اور مقامی سطح پر احتجاج وغیرہ۔ آخر کار یہ فیصلہ ہوا کہ اسے ان لوگوں کی تحویل میں دے دیا جائے جن کا اس سے مفاد وابستہ ہے، یعنی کارکنان اور مقامی بستی۔ اس حوالے سے چند قانونی سوالات بھی پیدا ہوئے، چنانچہ انہوں نے عدالت سے رجوع کرنے کا فیصلہ کیا تا کہ اس کی ملکیت کے قانونی حقوق حاصل کر سکیں۔ ان کا وکیل سٹاگھٹن لِنڈ (Staughton Lynd) تھا، ایک پرانا انقلابی جو کہ محنت کشوں کا وکیل بھی تھا۔ چنانچہ وہ لوگ عدالت پہنچ گئے اور ان کا موقف بھی وزنی تھا۔ تاہم عدالتوں نے ان کی موقف کو رّد کر دیا۔ عدالتیں کسی خیالی دنیا میں نہیں رہ رہی ہوتیں۔ وہ اسی چیز کی عکاسی کرتی ہیں جو معاشرے میں ہو رہا ہوتا ہے اگر اس کے پس پُشت وسیع تر عوامی طاقت ہوتی تو وہ لوگ غالباً جیت جاتے اور فولاد کی صنعت ابھی تک قائم ہوتی۔ ماسوائے اس کے کہ اس کا انتظام کارکنوں کے پاس ہوتا۔ اس طرح کی صورتحال کئی مرتبہ پیدا ہوتی ہے اور خواب حقیقت بننے کے قریب ہو جاتا ہے۔ اور میرے خیال میں یہ کوئی خیالی جنت کی طرح کا تصور نہیں ہوتا۔ یہ بنیادی قانونی نظام سے، بنیادی اقتصادی نظام سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہوتا ہے۔ اور اس کی بدولت بڑے پیمانے پر تبدیلی آ سکتی ہے۔

ماخذ:

https://chomsky.info/20100930/

5- زوال کی طرف تیزی سے گامزن: عالمی آب وہوا، سیاسی آب وہوا

نوم چومسکی کی ایم آئی ٹی سنٹر فار انٹرنیشنل سٹڈیز میں گفتگو

23 مارچ، 2017

مشعل نیوچ: مجھے معلوم ہے کہ آپ تالیاں میرے لئے نہیں بجا رہے۔ تاہم پھر بھی، ایم آئی ٹی سنٹر فار انٹرنیشنل سٹڈیز کے ایماء پر، میں مشعل، ڈائریکٹر آف پبلک پروگرامز، آپ کے سامنے موجود ہوں۔ اور آپ کو آج کے سٹارفورم (Starr Forum) میں خوش آمدید کہتی ہوں، جہاں مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہو رہی ہے کہ ہر ایک کو یادداشت مل چکی ہے۔ تاہم، سب سے پہلے میں چند ایک گھریلو امور/دلچسپی کے معاملات کا ذکر کروں گی۔

ہم نے آئندہ کے لئے بہت سی ایسی تقریبات کا اہتمام کیا ہے جن میں مجھے اُمید ہے کہ آپ بھی شرکت کر سکیں گے۔ ان میں سب سے قریبی تقریب 6 اپریل کو منعقد کی جائے گی، برطانیہ کے سابق سیکرٹری خارجہ جیک اسٹرا کے ہمراہ۔ وہ بریگزٹ، یورپ، اور ٹرمپ کے حوالے سے گفتگو کریں گے۔ جی ہاں، ہم نے آپ کی دلچسپی کے حوالے سے عمدہ تقریبات کے ایک پورے سلسلے کا اہتمام کر رکھا ہے۔

گیارہ اپریل کو ہم نے ''ڈیجیٹل انوویشن اینڈ افریقہ'' کے موضوع پر مذاکرے کا اہتمام کیا ہے جس میں افریقہ کی نئی ٹیکنالوجی کی طرف بہت عظیم جست کے عواقب پر تبادلہ خیال کیا جائے گا۔ اور بارہ اپریل کو ہم نے ایمبسڈر سیلسو اموریم (Celso Amorim) کے ہمراہ ایک کتاب

پر اظہار خیال کا پروگرام بنا رکھا ہے۔ یہ صاحب برازیل کے سابق وزیر برائے خارجہ تعلقات ہیں۔ ان مذاکروں کی تفصیلات اور ساتھ ہی دیگر پروگراموں کی بھی ہماری ویب سائٹ پر دستیاب ہیں یا پھر آپ واپسی پر یہاں سے دستی فہرست لیتے جائیں۔

آج کے مذاکرے کا اختتام سامعین کے ساتھ سوال وجواب کی نشست سے ہوگا۔ جو لوگ سوالات کرنا چاہتے ہیں، ان سے درخواست ہے کہ مائیک کے پیچھے قطار بنالیں۔ ہم یہ بھی درخواست کریں گے کہ اپنے علاوہ دوسروں کے وقت کا بھی خیال رکھیں جو کہ سوال کرنا چاہیں گے، کیونکہ یہ سوال وجواب کی نشست ہے نہ کہ ذاتی بیانات جاری کرنے کی۔

(تالیاں)

آخری بات یہ کہ ایک ایسی شخصیت کو متعارف کروانا ہمارے لئے واقعی اعزاز کی بات ہے جو کہ دراصل کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ برائے مہربانی نوم چومسکی کو خوش آمدید کہنے کے لئے ہمارا ساتھ دیں۔

(تالیاں)

نوم چومسکی: پہلا سوال، ہمیشہ کی طرح، یہ ہے کہ کیا آپ مجھے سُن سکتے ہیں؟ جی ہاں، ٹھیک ہے۔ چند برسوں سے مجھے ایک ایسے دلچسپ مباحثے نے مسحور کر رکھا ہے جو کہ آج سے پچیس برس قبل دو عظیم سائنسدانوں کے درمیان ہوا تھا، یعنی کارل سیگان اور ارنسٹ میئر۔ یہ لوگ غیر زمینی قسم کی ذہین مخلوق کے پائے جانے کے امکانات کے حوالے سے تبادلہ خیال کر رہے تھے۔

اور سیگان نے، جو کہ اس معاملے کو ایک فلکیاتی طبیعیاتی دان کے نقطہ نظر سے دیکھ رہا تھا، زمین سے ملتے جلتے سیاروں کی تعداد کا شمار کر ڈالا اور یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اس امر کے امکانات کافی زیادہ ہیں۔ میئر نے ایک ماہر حیاتیات کے نقطہ نظر سے کہا کہ دیکھیں ہمارے سامنے صرف ایک ہی مثال ہے، اور وہ ہے ہماری زمین، جہاں 50 ارب کے قریب انواع پائی جا چکی ہیں۔ اور ہم یہ سوال اُٹھا سکتے ہیں کہ زمین پر حیاتیاتی حوالے سے کامیابی کا معیار کیا ہے، اگر 50 ارب کے قریب انواع پر نظر ڈالی جائے تو۔

www.MashalBooks.org

اوراس نے یہ بھی عیاں کیا کہ ایک حیرت انگیز قسم کی باقاعدگی پائی جاتی ہے۔ جوانواع کامیاب ہیں، ہمارے اردگرد بے شمار، وہ اس طرح کی ہیں جو تیزی سے جینیاتی تبدیلی کا عمل کرتی ہیں، جیسے بیکٹیریا، یا وہ انواع جو متعین خصوصیت کی حامل ہیں، جیسے بھونرے، اور وہ اپنی جگہ برقرار رہتی ہیں، خواہ کچھ بھی ہو جائے تو جب آپ اس چیز کے درجے پر مزید اوپر چلے جاتے ہیں جسے ہم ذہانت کہتے ہیں، نتیجے کے طور پر حیاتیاتی شعبے میں کامیابی گھٹنے لگ جاتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ممالیہ زیادہ تعداد میں نہیں پائے جاتے۔ بندر نما مخلوق (Apes) کی تعداد بھی کم ہوتی جا رہی ہے۔ بھینسوں کی کثرت کی واحد وجہ یہ ہے کہ ہم انہیں گھریلو سطح پر پالتے ہیں۔ تاہم، کافی حد تک حیاتیاتی حوالے سے کامیابی میں ذہانت بڑھنے کے ساتھ ساتھ کمی واقع ہونے لگتی ہے۔

انسان، البتہ، اس اصول سے مُستثنیٰ نظر آتے ہیں، تاہم یہ ایک عارضی شماریاتی انحراف ہے، ارتقائی عمل کے دوران آخری دو ہزار برسوں پر محیط دراصل ایک مختصر سا لمحہ۔ چنانچہ اس کے نتیجے میں، بقول اس کے، ''زمین پر زندگی کی تاریخ اس دعویٰ کی تردید کرتی ہے کہ ذہانت حماقت سے بہتر ہے''۔ اس سے اصل میں جو کچھ ظاہر ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ ذہین ہونے سے احمق ہونا بہت بہتر ہوتا ہے۔ یہ ماحصل ہے۔

اس نے یہ نکتہ بھی عیاں کیا ہے کہ انواع کی زندگی کا اوسط دور تقریباً ایک لاکھ برس ہوتا ہے۔ ہمارے معاملے میں یہ دوگنا ہو چکا ہے۔ ہم زمین پر دو لاکھ برس گذار چکے ہیں، اور یوں ہم معدومیت کے متوقع مرحلے سے تھوڑا سا آگے نکل آئے ہیں۔

ہاں تو یہی وہ سوال ہے جو میں آج زیر غور لانا چاہتا ہوں۔ کیا ذہین ہونا بیوقوف ہونے سے بہتر ہے؟ اس کا حال ہی میں جواب انڈیا کے ایک بہت اچھے لکھاری نے دیا ہے۔ امیتابھ گھوش نے ایک کتاب لکھی ہے جس کا عنوان ہے ''دا گریٹ ڈیرینجمنٹ، کلائمٹ چینج اینڈ دا ان تھنک ایبل (عظیم ذہنی ابتری، موسمیاتی تبدیلی اور ناقابل تصور)''

اور، درحقیقت، انسانی تاریخ کی انتہائی پر ہیبت آزمائش سے نمٹنے میں ہماری ناکامی،

ایٹمی ہتھیاروں کے ممکنہ استثنیٰ کے ساتھ، واقعی ذہنی ابتری کی علامت، اور میٹر کے اس مفروضے/نظریے کی ظاہری معقولیت (Plausibility) کا ایک المناک ثبوت ہے کہ ذہین ہونے سے احمق ہونا بہتر ہوتا ہے۔ خوب، یہ ہماری بقا (وجود) کے حوالے سے دو عدد ایسی آزمائشیں ہیں جو کسی بھی اور آزمائش کے مقابلے میں غیر معمولی اہمیت کی حامل اور دوسرے تمام مباحث کو غیر اہم بنا کر رکھ دیتی ہیں۔ اور ان کی شدّت اور فوری خطرے کی صورت میں ہمارے حواس پر تسلّط کی خاکوں کے ساتھ عکاسی مشہور زمانہ ''ڈومس ڈے کلاک آف دا بلیٹن آف امریکن سائنٹسٹس'' کی صورت میں کی گئی ہے۔ اس کا آغاز 1947 میں ہوا تھا، عین اس وقت جب ایٹمی دور کی صُبح طلوع ہوئی تھی۔

2015 میں، اور پھر 2016 میں سوئی آگے کر دی گئی تھی۔ آدھی رات کا وقت ہمارے خاتمے کا نقارہ ہوگا۔ سوئی کو آدھی رات میں تین منٹ باقی والی جگہ پر کر دیا گیا۔

یہ 1980 کے آغاز میں آدھی رات کے قریب ترین وقت کی نشاندہی ہے، جب صدر ریگن کے دور حکومت کے ابتدائی برسوں میں خطرہ بہت بڑھ گیا تھا۔ اس کی وجہ یہ بتائی گئی تھی کہ ایٹمی جنگ کا خطرہ بہت بڑھ گیا ہے اور موسمیاتی تبدیلی کے مسئلے کا حل نکالنے کا عمل بھی ناکام ہو گیا ہے۔ میں ان کی اصل الفاظ یہاں دہراتا ہوں: ''اس وقت، ایک عالمی تباہی کا امکان بہت زیادہ ہو گیا ہے، اور اس خطرے کی شدّت میں کمی کے لئے درکار اقدامات کی فوری ضرورت ہے۔''

وہ 2016 کا وقت تھا۔ ٹرمپ کے دور حکومت کے آغاز میں، انہوں نے دریافت کیا، میں الفاظ دہرا رہا ہوں، ''وہ خطرہ اب پہلے سے بھی زیادہ ہے، عملی قدم اُٹھانے کی ہنگامی ضرورت ہے۔'' اور اس وقت انہوں نے گھڑی کی سوئی آدہی رات سے ڈھائی منٹ پہلے کے وقت پر کر دی۔

گھڑی کی سوئی ٹک ٹک آگے بڑھ رہی ہے۔ عالمی تباہی کا خطرہ سر پر مُنڈلا رہا ہے۔ یہ 1953 کے بعد سے خطرے کے قریب ترین ہے، یعنی اس وقت سے جب امریکہ اور روس نے ہائیڈروجن بموں کے دھماکے کئے تھے۔

انسانی وجود کو لاحق ان دو خطرات میں اہم نوعیت کا فرق پایا جاتا ہے۔ اگر کسی معجزے کے

www.MashalBooks.org

نتیجے میں ہم ایٹمی خطرے سے بچ بھی جاتے ہیں، اور کوئی بھی فرد دِل دہلا دینے والے ریکارڈ پر نظر ڈالے گا تو اسے احساس ہوجائے گا کہ یہ ایک معجزہ ہی ہے ہم ابھی تک بچتے چلے آرہے ہیں، تاہم اگر معجزانہ طور پر ہم بچ بھی جاتے ہیں، تو کم سے کم اصولی طور پر ہمیں معلوم ہے کہ اس وبا کو کس طرح ختم کرنا ہے، اس قہر سے کس طرح نجات حاصل کرنی ہے۔ البتہ عالمی حدّت کا معاملہ مختلف ہے۔

اس میں رعایت کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ ہم ناقابلِ واپسی مقام تک پہنچ سکتے ہیں، جب اتنا نقصان پہنچ چکا ہوگا کہ اس کی روک تھام مُشکل ہوجائے گی، اس کا رُخ موڑا نہیں جاسکے گا۔ اور لگتا ہے کہ وہ وقت اتنا دور نہیں ہے۔

نوعِ انسانی، عین اس وقت، ایک تجربہ کررہی ہے تاکہ ارنسٹ میئر کے اس سوال کا جواب حاصل کرسکے کہ آیا ذہین ہونا احمق ہونے سے بہتر ہوتا ہے؟ اور میں اس وقت یہی پسند کروں گا کہ اس تجربے کے طریق عمل مدّت عمل کا جائزہ لوں، صرف چند ایک تاریخوں کا چناؤ کرکے۔ لہٰذا ہم آج سے شروع کرتے ہیں، کسی بھی دن شروع کیا جاسکتا تھا، مگر ہم آج سے شروع کریں گے۔

اگر آپ آج صبح کی اخبار پر نظر ڈالیں تو آپ کو اس حوالے سے ایک رپورٹ دکھائی دے گی کہ ہم وجود کے حوالے سے ان دو بحرانوں سے کس طرح نمٹ رہے ہیں۔ ایک تو ایٹمی خطرے کا بحران، جس کا ذکر کرتے ہوئے، کرسٹوفر فورڈ، نیشنل سیکیورٹی کونسل سینیئر ڈائریکٹر فار ویپن آف ماس ڈسٹرکشن اینڈ کاؤنٹر پرولیفیریشن انڈر دا ٹرمپ ایڈمنسٹریشن، ہمیں مشورہ دیتا ہے کہ ہمیں ایٹمی ہتھیاروں سے پاک دنیا کے غیر حقیقی ہدف پر نظر ثانی کرنی چاہیے جس کی حمایت، علاوہ دیگر کے، ہنری کسنجر، جارج شلز، سام نن، اور ولیم پیری جیسے انتہا پسند جنگ مخالفین بھی کرتے ہیں۔ اور خیالی جنت میں رہنے والوں کے اس غیر حقیقت پسندانہ ہدف کو ترک کرنے کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ روسی جارحیت میں اضافہ ہورہا ہے، جو کہ حسن اتفاق سے ایک ایسا الزام ہے جسے ایک روایت شکن اخبار کے حالیہ شمارے میں بڑے موثر انداز میں بے اصل کرکے رکھ دیا گیا اور یوں پڑھنے کے قابل ہے، یعنی ''فارن افیئرز'' جو کہ ذی اثر حلقوں کا اہم جریدہ ہے۔

عالمی حدّت پر آج صبح ''نیشنل سنو اینڈ آئس ڈیٹا سنٹر'' نے رپورٹ دی ہے کہ منطقہ شمالی (Arctic) میں سردیوں کے اختتام پر سمندری برف پہلے سے کہیں کم ہوتی ہے۔ اس کا مطلب ہے زیادہ تاریک سمندر اور یوں شمسی توانائی کا زیادہ انجذاب، زیادہ گرمی۔ اور ہم اب ردّعمل مرغولے میں آچکے ہیں۔ کیا آپ جانتے ہیں اس کا کیا مطلب ہے۔

نومبر کے لئے اوسط درجہ حرارت معمول سے 23 درجے اوپر تھا۔ اور گذشتہ دو ماہ میں بعض اوقات یہ معمول سے 35 درجے اوپر چلا گیا۔ یہ آج کی اچھی خبر ہے۔

اب ہم گذرے ہوئے دن کی طرف جاتے ہیں، واشنگٹن پوسٹ سے اقتباس: خلیج میکسیکو کی سطح پر اور جنوبی فلوریڈا کے قریب پانی کا درجہ حرارت بلندیوں کو چھو رہا ہے۔ اسکے نتیجے میں ہوسٹن سے لے کر میامی تک تاریخی لحاظ سے گرم سردیوں میں کبھی بھی 73 ڈگری سے نیچے نہیں گرا جو کہ تاریخ میں پہلی بار ہوا ہے۔

گالویسٹن، ٹیکساس نے یکم نومبر سے لے کر اب تک 33 درجہ حرارت کے ایک حیرت انگیز اضافے کا ریکارڈ برقرار رکھا یا توڑ دیا ہے، جبکہ ہمسائے میں ہوسٹن نے اب تک کی گرم ترین سردیوں کا ریکارڈ قائم کردیا تھا۔ دونوں شہروں نے خزاں کے اواخر سے اب تک معمول سے کم درجہ حرارت کے چند ایک قیمتی ایام کا مشاہدہ کیا ہے اور یہ سلسلہ جاری ہے۔ میں معافی چاہتا ہوں اگر یہ نامنصفانہ ہے، تاہم میں اس خبر کے حوالے سے کسی قاری کے تبصرے کا حوالہ دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

وہ کہتا ہے، ''ری پبلکن ان سب مسائل پر گرفت کئے ہوئے ہیں۔ منصوبہ یہ ہے کہ جیف سیشنز اور ٹیڈ کروز کے والد کو ساحل سمندر پر ہاتھوں میں بائبل کے ساتھ کھڑا کیا جائے۔ جونہی آسمان پر اندھیرا ہو اور پانی کی سطح اوپر ہوجائے تو وہ اپنا بایاں ہاتھ اوپر اُٹھائیں گے، بائبل تھامے ہوئے، اور سمندر کو مستحکم سطح پر آنے کا حکم دیں گے۔ اور اگر یہ منصوبہ ناکام ہوجائے تو دوسرا منصوبہ (Plan-B) یہ ہے کہ دیوانوں کی طرح دوڑ لگاؤ اور الزام اوباما پر دھر دو۔

(تالیاں)

www.MashalBooks.org

اس سے بہتر الفاظ میں بیان کرنا مشکل تھا۔ یہ کلاسیکی ہے۔اور یہ وقت کی روح کا بڑی درستی سے احاطہ کرتا ہے۔

گذشتہ روز کاروباری اخبارات وجرائد میں ایک اور رپورٹ آئی ہوئی تھی ۔ بلوم برگ بزنس ویک کی شہہ سرخی، ''دا آئل بوم از بیک (تیل کی پیداوار میں ایک بار پھر اضافہ)'' اور میں اس میں سے ایک اقتباس پیش کروں گا۔

''امریکہ میں تیل اور گیس کے کنوؤں کی کھدائی کا کام 75 برسوں میں پست ترین سطح کو چھونے کے بعد دوگنی سطح پر پہنچ گیا ہے۔ ایسے وقت میں جبکہ دو درجن سے زائد قومیں تیل کی پیداوار میں کمی کرنے اور عالمی رسد میں بے پناہ اضافے کو روکنے کی اجتماعی کوششیں کر رہی ہیں، امریکہ میں تیل پیدا کرنے والی کمپنیاں دوسری سمت جارہی ہیں۔ گذشتہ چار ماہ کے دوران پیداوار میں پانچ لاکھ بیرل یومیہ کے حساب سے اضافہ ہوا ہے۔

اور اگر اضافہ اسی شرح سے ہوتا رہا تو معدنی تیل کی پیداوار میں گرمیوں تک اضافے کے نئے ریکارڈ بن جائیں گے۔ امریکہ یومیہ 90 لاکھ بیرل تیل پیدا کرتا ہے۔ ہم اس میدان میں آگے آگے ہیں۔

اس سے حالیہ تاریخ کی ایک بہت اہم حقیقت کی عکاسی ہوتی ہے۔ امریکہ سے باہر کی دنیا اقدامات کر رہی ہے، روک تھام کے اقدامات، تاہم اقدامات ہو رہے ہیں، بقا کو درپیش اثباتی (Existential) آزمائش سے نمٹنے کے لئے۔ اس دوران، امریکہ، عملاً اکیلا ہی، بڑے جوش و جذبے اور خلوص کے ساتھ تباہی کے راستے پر تیزی سے گامزن ہے جو کہ ایک انتہائی حیرت انگیز حقیقت ہے۔

اب، بلاشُبہ، تیل کی صنعت کو اس قدر معاونت فراہم کی جاچکی ہے کہ وہ تیزی سے اس راہ کی جانب پوری مدد کے ساتھ گامزن ہو جائے جتنی تیزی سے کہ وہ گامزن ہوسکتی ہے جو کہ بقا کے امکانات کو معدوم کر کے رکھ دیتی ہے۔ آئی۔ایم۔ایف کی رپورٹ کے مطابق زیرزمین موجود قدرتی تیل کی صنعت محصول ادا کرنے والے شہریوں کی جیب سے سالانہ 700 ارب ڈالر اعانت

(Subsidy) کے نام پر نکلوا لیتی ہے، جو کہ مائیک مالوانے کے ہدف یا نشانے پر نہیں ہے، مجھے یقین ہے۔اور صنعت کسی قسم کی غیر یقینی صورتحال پر یقین نہیں رکھتی۔ 2016 میں اس نے 10 کروڑ ستر لاکھ ڈالر مہم سازی میں اپنے حصّے کے طور پر لگا دیئے جبکہ واشنگٹن میں 720 حواریوں (Lobbyists) کا تقرر کیا جارہا تھا تاکہ کانگرس تک پیغام رسانی کو یقینی بنایا جاسکے۔

اور ظاہری طور پر ایسا ہی ہوتا ہے۔ حال ہی میں واشنگٹن پوسٹ میں ایک مضمون شائع ہوا ہے جس کے مطابق کانگرس میں ری پبلیکن پارٹی کے بہت سے نمائندے موسمیاتی تبدیلی کے شدید خطرے کی نوعیت کو تسلیم کرتے ہیں۔ تاہم وہ اس حوالے سے کوئی اظہار خیال اس لئے نہیں کرتے کیونکہ تیل کی صنعت کی طرف سے عطیات کی صورت میں ان پر دباؤ ڈال دیا جاتا ہے۔

یہ سب کچھ اس وقت خاص طور پر درست ثابت ہو گیا جب سٹیزنز یونائیٹڈ نے بڑے بڑے کاروباری اداروں کی طرف سے سیاسی عطیات کے لئے در اور بھی وا کر دیئے، جس کا مطلب ہے کہ آپ یا تو عطیات دینے والوں کی اطاعت کریں یا پھر میدان سے باہر ہو جائیں۔ ہاں، یہ کل کی بات ہے۔ اس طرح کی رپورٹیں روزمرہ کا معمول بن چکی ہیں۔ کوئی بھی دن نہیں گذرتا کہ آپ کو اس طرح کی چیزیں پڑھنے کو نہ ملتی ہوں۔

ہمیں اس تجربے پر نظر ثانی کرتے رہنا چاہیے جس سے انسان گذر رہے ہیں۔ میں گذشتہ چند ماہ سے کچھ تاریخوں کا انتخاب کروں گا۔ چنانچہ ہم 8 نومبر سے آغاز کرتے ہیں۔ یہ متفرق وجوہات کی بنا پر تاریخ کا ایک اہم دن تھا۔ 8 نومبر کو بہت سے واقعات پیش آئے تھے ان میں سے ایک کافی اہمیت کا حامل تھا۔ دوسرا تو بہت ہی زیادہ اہمیت کا حامل تھا، اور تیسرا مکمل طور پر حیران کُن قسم کا تھا۔

کافی اہم واقعہ امریکہ میں انتخابات کا انعقاد تھا۔ اس واقعے کا وسیع پیمانے پر احاطہ کیا گیا تھا، اس لئے میں اس حوالے سے کوئی بات نہیں کروں گا۔ بہت ہی زیادہ اہمیت کا حامل واقعہ مراکش میں پیش آیا۔ مراکش میں 8 نومبر کو کوئی 200 کے قریب ممالک اس حوالے سے اکٹھے

www.MashalBooks.org

ہوئے جسے سی او پی 22 (COP22) کہا جاتا ہے، اقوام متحدہ کے زیرِ اہتمام بین الاقوامی کانفرنس، عالمی حدّت کے مسئلے کے حل کے لئے ایک کوشش۔

اس کانفرنس کا ہدف یہ تھا کہ اسی برس پیرس میں ہونے والے مذاکرات کو دسمبر 2015 میں منعقد ہونے والی سی او پی 21 سے قبل کسی حد تک موثر و نتیجہ خیز بنا دیا جائے۔ کانفرنس کا یہ بھی مقصد تھا کہ ایک قابل تصدیق معاہدہ عمل میں لایا جائے۔ تاہم ایسا اس سبب سے ممکن نہ ہو سکا، کیونکہ ری پبلیکن کانگرس کسی طرح کی پابندیاں قبول کرنے کے موڈ میں نہیں تھی۔

اس لیے دنیا کو کسی حد تک کم فائدہ مند صورتحال پر سمجھوتہ کرنا پڑا، یعنی غیر رسمی معاہدے۔ اور مراکش میں ہونے والی سی او پی 22 نے مفروضہ طور پر اس عمل کو آگے بڑھانا تھا۔ یوں 8 نومبر کو کانفرنس کا آغاز ہو گیا۔

8 نومبر کو ورلڈ میٹیارولوجیکل ایسوسی ایشن نے ایک رپورٹ جاری کی، جس نے دوسرے لفظوں میں اس امر کی تصدیق کر دی کہ 2016 تاریخ کا گرم ترین برس تھا، قبل از صنعتی دور کے درجہ حرارت سے واضح طور پر 1.1 درجہ سینٹی گریڈ اوپر، گذشتہ برس کے ریکارڈ سے بہت زیادہ، اور درحقیقت اس مطلوبہ حد کی طرف رواں دواں جس کا پیرس میں ایک ہدف کے طور پر تعین کیا گیا تھا اور دیگر خطرناک قسم کی رپورٹیں بھی جو میں پڑھنا نہیں چاہتا۔ تاہم آپ کو یہ انٹرنیٹ پر مل جائیں گی، اگر آپ ڈھونڈنا چاہیں تو۔ یہ تھی ورلڈ میٹیارولوجیکل ایسوسی ایشن کی روداد۔

تاہم، بعد ازاں غور و فکر کے مراحل اختتام پذیر ہو گئے۔ امریکہ سے انتخابات کے نتائج موصول ہو چکے تھے۔ کانفرنس ضروری طور پر روک دی گئی، بحث مباحثے کے لئے کچھ بھی نہیں رہا تھا۔

واحد سوال یہ تھا کہ آیا یہ ممکن رہے گا کہ تباہ شدہ ملبے سے کوئی شے صحیح و سالم برآمد کر لی جائے، جبکہ دنیا کا اہم ترین، امیر ترین اور تاریخ میں طاقتور ترین مُلک، حکومت کے تینوں اہم ستونوں کے ساتھ، تباہی کی طرف جانے پر تُلا ہوا تھا۔ کیا کیا جا سکتا تھا؟ تاہم کچھ اُمید باقی رہ گئی تھی۔

امکانی مسیحا کے طور پر ان کی نظرِ انتخاب ایک ملک پر پڑی، یعنی چین پر۔ یہ 8 نومبر کا دن تھا، 8 نومبر کا انتہائی اہم واقعہ۔ کانفرنس جاری رہی مگر کسی نتیجے کے بغیر اختتام پذیر ہو گئی۔

ہاں تو تیسرا واقعہ مکمل طور پر حیران کُن تھا، یعنی آزاد دنیا کا قائد دنیا کو تباہی کی جانب دھکیل رہا تھا۔ دنیا اپنے بچاؤ کے لئے چین کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اور ردّعمل کیا تھا، خاموشی، اس حوالے سے کچھ بھی نہیں کہا گیا۔

9 نومبر کا اخبار اُٹھا لیں، بی بی سی کی 9 نومبر کی اور بعد کے دنوں کی نشریات سُن لیں اور آپ کو اس حوالے سے کوئی خبر، کوئی تبصرہ بھی نہیں ملے گا۔ یہاں تاریخ کا انتہائی محیّر العقول واقعہ منظر عام پر آ رہا ہے، دنیا کا سب سے طاقتور مُلک، تاریخ میں انتہائی بااثر حیثیت رکھنے والا، غیر معمولی برتری، ناقابل موازنہ مقام کا مالک، دنیا کو تباہی کی طرف دھکیلنے میں آگے آگے گامزن ہو رہا ہے۔ اور دنیا یہ آس لگائے بیٹھی ہے کہ ہوسکتا ہے ہمیں چین کسی حد تک بچا لے۔

کیا آپ تاریخ میں کسی ایسی صورتحال کا تصور کر سکتے ہیں؟ کچھ بھی کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ 8 نومبر کی حیران کُن حقیقت ہے۔ یہ 8 نومبر کا دن ہے۔

اب ہم آگے یکم مارچ کی طرف پیش قدمی کرتے ہیں، اور دنیا اور امریکہ دونوں کے بارے میں بات کرتے ہیں۔ دنیا میں ایک تحقیق جاری کی گئی تھی جس کے مطابق شمالی مغربی کینیڈا میں اب تک منجمد چلی آنے والی کئی ہزار میل طویل برفانی سطحیں تیزی سے پگھل رہی ہیں، اور اس کے ساتھ ہی الاسکا، سائبیریا، اور اسکینڈے نیویا میں بھی برفانی سطحیں تیزی سے زوال پذیر ہو رہی ہیں۔ اور اس میں یہ نکتہ بھی عیاں کیا گیا کہ اس کا نتیجہ گرین ہاؤس گیسوں کے وسیع پیمانے پر اخراج کی صورت میں برآمد ہوسکتا ہے، جیسے کاربن ڈائی آکسائیڈ (CO_2) اور میتھین گیس، جس میں تیزی آ گئی ہے۔ بلاشُبہ، منطقہ شمالی (Arctic) سے اُٹھنے والی اس گرم لہر کی بدولت جس کی نظیر نہیں ملتی اور جو ہر گزرتے برس کے ساتھ ساتھ بدتر ہوتی جا رہی ہے۔ یہ ہے دنیا کا حال۔

امریکہ میں ٹرمپ انتظامیہ نے یکم مارچ کو اس نام نہاد میتھین رول (Methane Rule) کی تنسیخ کر کے اخراج کے عمل کو مزید تیز کرنے میں معاونت کر دی جس کے تحت وفاقی علاقوں

www.MashalBooks.org

میں تیل اور گیس کی کھدائی والے مقامات سے میتھین کا اخراج محدود رکھا جاتا ہے۔ چنانچہ تیل کی پیداوار میں فراوانی اور فضا میں میتھین کے اخراج میں اضافے کا عمل تیز کرنے کا یہی طریقہ ہے۔ میتھین کاربن ڈائی آکسائیڈ سے بھی بہت زیادہ خطرناک ہے، اگرچہ یہ زیادہ عرصہ برقرار نہیں رہتی۔

اسی طرح یکم مارچ کو انوائرنمنٹ پروٹیکشن ایجنسی کے عملے اور پروگراموں میں وسیع پیمانے پر تخفیف کے اعلان کے ساتھ ہی تحقیق پر پابندی کا فرمان بھی جاری کر دیا گیا۔ ہم ان موضوعات کے حوالے سے کچھ بھی سُننا نہیں چاہتے۔ یہ تھا یکم مارچ کا دن۔

اب ہم 16 مارچ کی طرف آتے ہیں۔ دنیا کا حال، بڑی بڑی چٹانوں پر مُشتمل رُکاوٹوں کے سلسلے (Great Barrier Reef) کو پہنچنے والے نقصان پر کی جانے والی تحقیق جاری کر دی گئی ہے، یہ دنیا کی عظیم ترین فعال ساختوں (Living Structures) میں سے ایک ہے جس کو پہنچنے والا نقصان کافی شدید قسم کا ہے۔ اور رپورٹ کے مطابق یہ 1988 سے مرجانی چٹانوں (Coral Reefs) کی بڑے پیمانے پر سفیدی (Mass Bleaching) سے ہونے والے انتہائی وسیع وعریض اور ضرررساں واقعات میں سے ایک ہے، جس کے ایسے وسیع تر تباہ کن اثرات ہوں گے کہ جن کا آپ میں سے اکثر کو علم ہوگا۔ ہاں تو یہ تھا دنیا کا حال۔

16 مارچ کو امریکہ میں ٹرمپ کا بجٹ پیش کر دیا گیا۔ انوائرنمنٹل پروٹیکشن ایجنسی کا عملاً" خاتمہ کر دیا گیا۔ اسے اب زیادہ تر سینیٹر انہوف اور اس کے ساتھی چلا رہے ہیں۔

انہوف، کئی برسوں سے سینیٹ کے اندر موسمیاتی تبدیلی سے انکار کرنے والوں کی صف اوّل میں شامل چلا آرہا ہے۔ وہ ایک انتہا درجے کا بنیاد پرست ہے۔ اور اس کا موقف یہ ہے کہ زمین خدا کے حکم پر گرم ہو رہی ہے، اس لئے یہ ایک حقیقت ہے۔ اور خدا کی مرضی میں دخل دینا ایک ناپاک حرکت ہوگی۔

یہ دنیا کے ایک انتہائی طاقتور، ترقی یافتہ، اور نفیس نظریات والے ملک کا حال ہے۔ اور یہ ابھی بہت تھوڑی سی مثال ہے۔ موسمیاتی تبدیلی کے حوالے سے عمل اور تحقیق کے لئے ای پی اے

(EPA) ایک معمولی سا ادارہ ہے۔

اس سے بھی زیادہ اہمیت کا حامل ڈیپارٹمنٹ آف انرجی ہے۔ یہ اب ایک ایسے شخص کے زیر انتظام ہے جس نے دو برس قبل ہی اس سے جان چھڑانے کا ارادہ کر لیا تھا، جب اسے یہ علم نہیں تھا کہ ایٹمی ہتھیاروں کا انتظام اسی ادارے کے پاس ہے۔ لہٰذا ہم اس کو اپنے پاس رکھیں گے، مگر مکمل طور پر نہیں۔

بجٹ کے مطابق آفس آف سائنس کو، جو کہ ڈیپاٹمنٹ آف انرجی میں آتا ہے، 90 کروڑ ڈالر کی رقم سے محروم کر دیا جائے گا۔ یہ اس کے کل بجٹ کا تقریباً 20 فی صد بنتی ہے۔ اس کا 30 کروڑ ڈالر کا اے پی آر اے (APRA) توانائی پروگرام مکمل طور پر ختم کر دیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ای پی اے اور این او اے اے (دانیشنل اوشنک اینڈ ایٹموسفیرک ایڈمنسٹریشن) کے تحقیقات پروگراموں میں بھی بہت زیادہ کٹوتیاں کی گئی ہیں، اور ناسا کے اَرتھ سائنس کے بجٹ میں بھی 5 فی صد کٹوتی کر دی گئی ہے۔

بجٹ، عام طور پر، ایک غیر معمولی قسم کی بے ہودگی ہوتی ہے، حتیٰ کہ ری پبلیکن حلقہ اثر کے پال ریان ونگ کے لئے بھی، جو کہ اب ٹرمپ/ سپائسر ا ٹوئٹر کے پردے کے پیچھے بڑے موثر طریقے سے سرگرم عمل ہے، تاکہ ہر روز شہہ سُرخیوں میں نمایاں رہا جائے۔ بجٹ، اگر آپ اس پر نگاہ ڈالیں، مزدور طبقے اور غریب افراد پر ایک غضبناک حملہ ہوتا ہے، اور امیر افراد اور کاروباری شعبے پر بے پناہ نوازشات کرتا ہے۔ اور ایک ایسے عمل کے ساتھ ساتھ، جسے، میرے خیال میں، صرف اور صرف امریکہ کی ایسی طالبنائزیشن کے طور پر بیان کیا جا سکتا ہے جو کہ بینن، سیشنز ڈی ووس کے مثالی یا تصوراتی معاشرے سے مطابقت رکھتا ہے، جو کہ ان کے بقول سفید فاموں کی برتری کی یہودی، مسیحی روایت کی پیروی اور انسانی تہذیب وتمدن، فنون، اسکولوں کے نظام اور اس کے علاوہ طبّی تحقیق کے شعبے کی تباہی پر مبنی ہے۔ یہ ایک ایسا ہدف ہے جس کی ہم اس ملک میں پیروی کر رہے ہیں جبکہ عالمی سطح پر ہم تباہی کی سمت تیزی سے گامزن ہیں۔

عملی طور پر سائنسی جریدوں کا ہر شمارہ پہلے سے زیادہ وحشتناک پیش گوئیاں فراہم کرنے

www.MashalBooks.org

لگا ہے۔آپ میں سے جولوگ باقاعدگی سے سائنسی جرائد کا مطالعہ کرتے ہیں، انہیں یہ سب کچھ مانوس سا لگے گا۔ لہٰذا ایٹموسفیرک کیمسٹری اور فزکس کے شعبے میں ایک حالیہ تحقیق، جو کہ مقالے کی صورت میں جیمز ہینسن اور دیگر 18 سائنسدانوں نے پیش کیا ہے، آج کے دور کی آب و ہوا اور ایک لاکھ بیس ہزار برس قبل کی اس آب و ہوا کے درمیان موازنہ پیش کرتی ہے، جو کہ آج کے دور کے مقابلے میں اتنے ہی درجہ حرارت یا اس سے ذرا زیادہ درجہ حرارت کی حامل تھی۔ اس کا نتیجہ بھی ایک لاکھ بیس ہزار برس قبل سطح سمندر میں 20 تا 30 فٹ اضافے کی صورت میں برآمد ہوا تھا جب قطبین پر جمی ہوئی بہت سی برف ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی تھی۔

اس تحقیق کے مطابق مستقبل قریب میں ایسے تباہ کن طوفانوں کا امکان ہے جو جدید دور میں آنے والے کسی بھی طرح کے طوفانوں کے مقابلے میں انتہائی شدّت کے حامل ہوں گے، قطبین پر جمی ہوئی برف کی تہوں کے بڑے بڑے ٹکڑوں کے ٹوٹنے سے برفانی تودے پگھلنا شروع ہو جائیں گے۔ یہ عمل بہت تیزی سے ہو رہا ہے، خصوصاً منطقہ شمالی میں، جہاں صورتحال انتہائی خطرناک ہو چکی ہے۔ اور پیش گوئی کی جا رہی ہے کہ سطح سمندر میں اس قدر اضافہ ہو جائے گا دنیا کے ساحلی شہر اس صدی کے اختتام سے قبل ڈوبنا شروع ہو جائیں گے۔ ہینسن کے مطابق خطرہ یہ ہے کہ ہم نوجوان نسل کو ایک ایسی صورتحال سے دوچار کرنے لگے ہیں جو کہ ان کی گرفت سے باہر ہے اور سطح سمندر میں تیزی سے ہوتے ہوئے اضافے کی بدولت، جو کہ کوئی زیادہ دور کی بات نہیں ہے، دیگر خطرناک نتائج بھی سامنے آ جائیں گے۔

ایسے تحقیقی جائزے بھی موجود ہیں جو اس امر کی نشاندہی کرتے ہیں کہ موسمیاتی تبدیلی کی رفتار گذشتہ دس کروڑ برسوں میں آنے والی تبدیلی کی کسی بھی رفتار سے تیز ترین ہے، اور بعض تخمینوں کے مطابق یہ بہت ہی تیزی سے واقع ہو رہی ہے۔ گذشتہ برس، غالباً آپ کے علم میں ہو گا، کُرہ فضا میں کاربن ڈائی آکسائیڈ (CO_2) کی مقدار 400 ذرات فی دس لاکھ کی علامتی سطح سے بھی تجاوز کر گئی تھی۔ اسے ایک فیصلہ کُن طور پر خطرناک مرحلہ سمجھا جاتا ہے۔

ایسا 40 لاکھ برسوں میں پہلی مرتبہ ہوا ہے اور شاید ناقابل تلافی طور پر۔ یہ اس طرح کی

دیگر بے شمار رپورٹوں کا ایک چھوٹا سا نمونہ ہے۔ یہ بڑے بڑے سائنسی جرائد میں تسلسل سے شائع ہو رہی ہیں، اور بعض اوقات عوامی ذرائع ابلاغ تک بھی پہنچ جاتی ہیں۔

اس دوران ری پبلیکن کی غارت گر قسم کی مشینری سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ان اداروں کو تباہ کرتی جا رہی ہے جو ایک معیاری زندگی کے حوالے سے اُمید کی کرن ہیں۔ اور یہ صرف ٹرمپ ہی نہیں ہے۔ اس عمل میں ساری کی ساری ری پبلیکن قیادت شامل ہے، قومی سطح پر بھی اور کافی حد تک مقامی سطح پر بھی۔

اور یوں شمالی کیرولینا میں، مثال کے طور پر، کوئی دو برس قبل، کوسٹل ریسورسز کمیشن کی طرف سے ایک سائنسی تحقیق کا اہتمام کیا گیا۔ اس میں تخمینہ لگایا گیا تھا کہ اس صدی کے اواخر تک سطح سمندر میں 39 انچ کا اضافہ ہو جائے گا۔ ری پبلیکن کے زیر انتظام ریاستی قانون ساز ادارے کی طرف سے ردّعمل دیا گیا تھا۔ انہوں نے ایک ایسا قانون منظور کیا جس کے تحت ریاستی اور مقامی اداروں کو ایسے قواعد کی تشکیل یا دستاویزات کی تیاری سے روک دیا گیا تھا جو سطح سمندر میں اضافے کی پیش بینی کرتے ہوں، معقول ردّعمل۔

اس صورتحال پر سٹیفن کولبرٹ نے بہت اچھا تبصرہ کیا۔ اس کا کہنا تھا کہ یہ ایک زبردست حل ہے۔ اگر سائنسی تحقیق کے ایسے نتائج سامنے آئیں جو آپ کو ناپسند ہوں، تو ایک قانون منظور کروا لیں جس کے تحت ان نتائج کو غیر قانونی قرار دے دیا جائے، مسئلہ حل۔

اس مثال سے ری پبلیکن پارٹی کی قیادت کی ذہنیت اچھی طرح آشکار ہو کر رہ جاتی ہے۔ چند برس قبل، بابی جنڈل، ری پبلیکن گورنر نے لوئزیانا کو اور بھی زیادہ پستی میں دھکیلنے میں کامیابی حاصل کر لی تھی۔ اس نے ری پبلکن کے لوگوں کو خبردار کرتے ہوئے کہا کہ وہ ’’احمقوں کی جماعت‘‘ بنتے جا رہے ہیں۔

معزز قدامت پسند سیاسی تجزیہ نگار تھامس مان اور نارمن آرنسٹین کے مطابق جو کہ دائیں بازو کے امریکن انٹرپرائز انسٹیٹیوٹ سے تعلق رکھتے ہیں، یہ جماعت، یا غالباً سابقہ جماعت ایک ایسی روایت شکن بغاوت کی طرح ہے جس نے پارلیمانی جمہوریت کو ترک کر دیا ہے۔ شاید ایک

www.MashalBooks.org

سادہ سی درجہ بندی وہ انتہائی اشتعال انگیز الزام ہے جس کے تحت انہیں تاریخِ انسانی کی سب سے خطرناک تنظیم قرار دیا گیا ہے، جس نے خود کو انسانی بقا کے خاتمے کے امکانات کی اُمید ختم کر دینے کے مقصد سے وابستہ کر لیا ہے۔ یہ اشتعال انگیز ہے، تاہم اس سے بھی سوال یہ ہے کہ آیا یہ غلط ہے۔ میں اس کا جواب آپ پر چھوڑتا ہوں کہ آپ خود ہی سوچ لیں۔

میں نے پہلے ہی پیرس 2015 (سی او پی 21)، مراکش 2016 کا ذکر کیا ہے۔ 2016 کی بنیادی مُہم کئی لحاظ سے بہت نمایاں تھی، بنیادی طور پر ان پہلوؤں سے جنہیں موضوع بحث ہی نہیں لایا گیا، یعنی موسمیاتی تبدیلی کے مسئلے کے حوالے سے اُمیدواروں کا طرزِ عمل، جس پر شاید ہی کوئی تبصرہ کیا گیا ہو۔

ہر ایک اُمیدوار نے اس امر کی نفی/تردید کی کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ ہو رہا ہے، ماسوائے چند ایک معقول سوچ کے حامل اعتدال پسندوں کے مثلاً جیب بُش، جس کا کہنا تھا کہ یہ غیر یقینی صورتحال ہے، تاہم ہمیں کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ ہم فریکنگ (کھدائی کے بعد زمین میں کئے گئے سوراخ میں بہت دباؤ کے ساتھ سیال ڈالنے کا عمل تا کہ اس طرح سے زمین سے تیل یا گیس کو باہر اُبل پڑنے پر مجبور کیا جا سکے) یا پھر جان کاسِچ (John Kasich) کی مہربانی سے زیادہ سے زیادہ قدرتی گیس پیدا کر رہے ہیں۔ وہ جان کاسِچ جو مفروضہ طور پر پختہ ذہنیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے کم سے کم یہ تو مان گیا تھا کہ عالمی حدّت کم سے کم ایک حقیقت ہے۔ وہ اوہیو کا گورنر ہے اس کا کہنا تھا کہ ہم اوہیو میں کوئلہ جلانے کا سلسلہ شروع کرنے لگے ہیں اور ہم اس حوالے سے معذرت خواہانہ طرزِ عمل اختیار نہیں کریں گے۔ یہ ایک سمجھدار آدمی ہے۔

جہاں تک ذرائع ابلاغ کا تعلق تھا، انہوں نے یہ سب نظر انداز کر دیا۔ اس حوالے سے تقریباً کچھ بھی نہیں کہا گیا۔ آخر کو یہ انسانی تاریخ کا اہم ترین مسئلہ تھا۔

اور آپ اس حوالے سے ذرائع ابلاغ کو موردِ الزام نہیں ٹھہرا سکتے، کیونکہ وہ معروضیت کے ایک ایسے تصور کی پیروی کر رہے ہیں جو صحافت کی تعلیم کے دوران پڑھایا جاتا ہے۔ معروضیت کا مطلب ہوتا ہے کہ اس امر کی بالکل درست خبر دینا کہ واشنگٹن کے حلقوں میں مخصوص سیاسی اور

سماجی اذہان کیا سوچ رہے ہیں۔ یوں آپ کو اس حوالے سے بالکل درست خبریں دینی ہوتی ہیں کہ وہ لوگ کیا کہہ رہے ہیں۔

اگر تو آپ کسی اور موضوع پر بات کر رہے ہیں، تو یہ تعصب یا رائے یا کوئی بھی کج روی ہو گی۔ مگر حقیقی معنوں میں خبر پہنچانے کا عمل نہیں ہو گا۔ یوں چونکہ واشنگٹن کے سیاسی اور سماجی حلقوں، بشمول ڈیموکریٹس کی محفلوں میں جو کچھ بھی ہو رہا ہے، وہ انکار یا بےخبری ہے، یا پھر ری پبلیکنز کے معاملے میں صاف صاف نظریں چرانا ہے حقیقت سے، تو پھر ہم اس کی خبر نہیں دیتے، کیونکہ یہ وہ کچھ نہیں ہے جو سیاسی اور سماجی محفلوں میں کہا جا رہا ہے۔ یہ معروضی نہیں ہے۔

ہاں تو، حتیٰ کہ سمندر کی سطح میں وہ اضافہ بھی جو کہ اس سے بہت محدود تر ہے جس کی پیش گوئی کی جا رہی ہے، ساحلی شہروں کو، اور اس سے بھی بڑھ کر، ساحلی میدانوں کو ڈبونے کے لئے کافی ہے، جیسے بنگلہ دیش کی ساحلی پٹیاں، جہاں جلد ہی لاکھوں لوگ، غالباً مستقبل قریب میں، جان بچانے کے لئے بھاگ رہے ہوں گے۔ ایسے چٹیل میدان بھی ہیں جو پانی میں غرقاب ہونے لگے ہیں، اور بہت سے بعد میں غرق ہو جائیں گے۔ یہ صورتحال اتنی گمبھیر ہو گی کہ اس کے مقابلے میں آج کے پناہ گزینوں کا مسئلہ محض چائے کی دعوت کی طرح لگے گا۔

بنگلہ دیش میں، ماحولیات کے ایک اہم سائنسی ماہر کا کہنا ہے کہ اب مہاجرین کو یہ حق حاصل ہو گا کہ ان ملکوں کی طرف کوچ کر جائیں جہاں سے یہ ساری آلودہ گیسیں خارج ہو رہی ہیں۔ کروڑوں لوگوں کو اس قابل ہونا چاہیے کہ وہ امریکہ جا سکیں۔ یہ اس ملک کے حالیہ مزاج یا کیفیت کے عین مطابق ہے جو کہ طویل عرصے سے نہ صرف دنیا کا امیر ترین اور محفوظ ترین ملک چلا آ رہا ہے بلکہ انتہائی خوفزدہ بھی۔

اور جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یورپ میں جانا بہتر رہے گا انہیں عوامی رائے کے حالیہ جائزے کی طرف رجوع کرنا چاہیے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یورپی باشندوں کی اکثریت مسلم اکثریت والے ممالک سے لوگوں کی نقل مکانی پر مکمل پابندی چاہتی ہے۔ تو تجویز یہ نظر آتی ہے کہ پہلے ان ممالک (نقل مکانی کرنے والے لوگوں کے کم ترقی یافتہ ممالک) کو تباہ کر دیا جائے، پھر وہاں

www.MashalBooks.org

سے فرار ہونے کی کوشش کرنے والوں کو سزا دی جائے جو ایسے کھنڈرات سے باہر نکلنے کے در پے ہوں جو ہم نے پیدا کر دیئے۔اور ہم نے اس کے لئے اصطلاح بھی ایجاد کر رکھی ہے۔ہم اسے پناہ گزینوں کا بحران کہتے ہیں۔

بہت خوب منظر ہوگا، ہزاروں لوگ، مایوس کن حالت میں، بحیرہ روم میں ڈوبتے ہوئے افریقہ سے فرار ہونے کی کوشش کر رہے ہوں، جہاں یورپ کی ایک اپنی تاریخ ہے جو آپ کو معلوم نہیں ہے۔یہی کچھ امریکہ اور بلاشبہ وسطی امریکہ اور مشرق وسطیٰ کے حوالے سے بھی درست ہے۔ اور درحقیقت ، پناہ گزینوں کا نام نہاد بحران اصل میں مغرب کے اندر ایک سنجیدہ ، شدید قسم کا اخلاقی اور ثقافتی بحران ہے۔

جی ہاں، بقا کے حوالے سے یہ دونوں بحران باہم منسلک ہیں۔ ہمالیہ کے برفانی تودے یا برف زار قطعات پگھل رہے ہیں۔اور مستقبل قریب میں اس کے نتیجے میں جنوبی ایشیا کو پانی کی فراہمی کے حوالے سے خطرات لاحق ہو سکتے ہیں، جہاں پانی کی سطح پہلے ہی بہت خطرناک حد تک نیچے جا چکی ہے۔

یوں، بھارت میں تیس کروڑ لوگوں کو عین اس وقت پینے کے لئے پانی کی قلت کا سامنا ہے۔اس کی بدولت بھارت اور پاکستان میں تصادم کی راہ بڑی آسانی سے ہموار ہو سکتی ہے، ایٹمی اسلحے سے لیس دو ایسی ریاستیں جو مسلسل ایٹمی جنگ کے خطرے سے دو چار رہتی ہیں۔عین اس وقت، حقیقت یہ ہے کہ ایٹمی جنگ کا نتیجہ انڈیا اور پاکستان کی تباہی کی صورت میں برآمد ہوگا، تاہم اس سے بھی بدتر امکان یہ ہے کہ ایٹمی سردی کے دور کا آغاز ہو جائے گا، یعنی عالمی سطح پر قحط سالی، جس کی بدولت زمین پر منظم زندگی کا بہت حد تک خاتمہ ہو جائے گا۔اور یہ منظر اتنا دور نظر نہیں آتا، اگر اس کا تصور کر سکیں۔

ہاں تو اس کی بدولت ہم ایک حتمی تاریخ پر نگاہ ڈال سکتے ہیں، انسانی تاریخ کا ایک اہم ترین دن، یعنی جنگ عظیم دوم کا خاتمہ۔ یہ ایک مسرور لمحہ تھا، مگر دہشتناک بھی، ایٹمی دور کے آغاز کی بدولت مجھے 6 اگست کو خود اپنے احساسات بھی اچھی طرح یاد ہیں، دِل ہلا دینے والے واقعات

اور ان کے مسلسل مضمرات کی دہشت، ان کی اہمیت، اور اس پر یہ حیرت کہ کتنے تھوڑے لوگ ہیں جو فکر مند نظر آتے ہیں، اس واقعے کی شدّت یا عظیم تر اثرات کے حوالے سے یا پھر اس حقیقت کے حوالے سے کہ ہم ایک ایسے دور میں داخل ہو چکے ہیں جو انسانی بقا کا آخری دور ہوگا، یعنی ایٹمی دور، وہ لمحہ جب انسانی ذہانت و صلاحیت ایسے وسائل فروغ دینے میں کامیاب ہو گئی تھی جو ہم سب کو فوراً ہی ملیا میٹ کر کے رکھ سکتے ہیں۔

1947 میں، تھوڑے عرصے کے بعد یوم حشر کی ساعت جلوہ افروز ہو گئی۔اور اس وقت سوئی کو آدھی رات سے سات منٹ پہلے والی جگہ پر رکھ دیا گیا۔اور یاد رہے کہ اب ہم یوم حشر سے صرف ڈھائی منٹ کی دوری پر ہیں۔

ہاں جی ،ہم نہ صرف ایٹمی دور میں داخل ہو چکے ہیں بلکہ زمین پر انسانی سرگرمی کے اثرات کے (Anthropocene) اس نام نہاد دور میں بھی، جس میں انسانی اعمال کے نتیجے میں ماحول ڈرامائی طور پر تبدیل یا متاثر ہوتا دکھائی دے رہا ہے۔انسانی سرگرمی کے اس دور کے آغاز کی مناسب تاریخ کے حوالے سے مباحثہ جاری ہے، تاہم ''ورلڈ جیالوجیکل سوسائٹی'' نے اپنا فیصلہ کر دیا ہے۔اس نے 1950 کو اس دور کا نقطہ آغاز قرار دے دیا ہے۔

ایسا کچھ حد تک تو ان تابکار عناصر کی بدولت ہے جو ایٹمی ہتھیاروں کے تجربات اور دیگر انسانی سرگرمیوں، بشمول آلودہ گیسوں کے تیزی سے اخراج کے ساتھ ساتھ فضا میں پھیلتے چلے گئے۔اس لئے ایٹمی دور اور انسانی سرگرمیوں کے اثرات کا دور بنیادی طور پر ایک ساتھ شروع ہوئے۔یہ مابعد عالمی جنگ کے زمانے کے رزمیے (Epics) ہیں۔

اب ہم واضح طور پر اس دور میں بھی قدم رکھ چکے ہیں جسے کہ معدومیت یا فنا کا چھٹا دور کہا جاتا ہے۔امکان یہی ہے کہ یہ معدومیت کے اس پانچویں دور کی طرح ہوگا جو چھ کروڑ ساٹھ لاکھ برس پہلے آیا تھا جب ایک بہت بڑا سیارہ (Asteroid) زمین سے ٹکرانے کے نتیجے میں 75 فی صد انواع تباہ ہو گئیں اور ڈائنوسار کے عہد کا خاتمہ ہو گیا۔اس تباہی یعنی ڈائنوسار کے خاتمے نے چھوٹے ممالیہ جانوروں کی بقا کی راہ ہموار کر دی اور وہ زمین پر پھیل کر ارتقا پذیر ہونے لگے، اور

www.MashalBooks.org

آخر کار کوئی دو لاکھ برس قبل انسان بن کر رہ گئے۔ ایک طویل مدت تک انسانوں کے اثرات محدود تر رہے۔ تاہم، اب اس دور تک مابعد جنگ کے زمانے میں ہم ایک اور تباہ کُن سیارہ بن چکے ہیں ، انواع کو بڑے پیمانے پر تباہ کرتے ہوئے، اور آخر کار خود کو بھی جو کہ کوئی دور کی بات نہیں ہے۔

یہ انواع کی معدومیت یا فنا ہونے کے واقعات کے بڑے محتاط قسم کے جائزے ہیں اور ان کے چند ایک دلچسپ قسم کے نتائج برآمد ہوئے ہیں۔ ان نتائج سے ظاہر ہوتا ہے کہ اب کی بار فنا ہونے کا عمل گذشتہ ادوار کی نسبت بڑے دلچسپ انداز میں مختلف ہو گا۔ پہلے والے ادوار میں انواع کی تباہی بلا استثنیٰ تھی۔ تمام انواع تباہی کی زد میں آ گئی تھیں۔

یہ دور مختلف ہے۔ یہ زیادہ تر بڑی جسامت کے جانور ہیں جو غیر متناسب انداز میں معدوم ہو رہے ہیں۔ اور یہ سب کچھ ابتدائی دور کے انسانوں کی، ہمارے آباؤاجداد کی تاریخ کے سرسری جائزے یا مطالعے سے آشکار ہوتا ہے، جو دس لاکھ برس پہلے زمین پر آباد تھے۔

اور انہوں نے اپنی بستیوں کو بہت زیادہ پھیلا دیا تو بڑے ممالیہ جانور زوال پذیر ہو گئے۔ اور ہمارے ساتھ قریبی طور پر منسلک انواع میں سے صرف ایک باقی رہ گئی ہے، لہٰذا ایسے سوالات پیدا ہوتے ہیں جن پر آپ کو غور کرنا پڑے گا۔ اور ان میں سے ایک وہ سوال ہے جو طویل عرصے سے ہمارے سامنے ہے، ارنسٹ میئر کی طرف سے پوچھا گیا: ''کیا ذہین ہونا احمق ہونے سے بہتر ہے؟

اب اس سوال کا جواب دینے کے لئے ہمارے پاس صرف چند برس رہ گئے ہیں، زیادہ نہیں۔ تو ہم اس کا کیا حل کرنے لگے ہیں؟ ٹھیک ہے، ایک قدم تو یہ تھا کہ جو جارج بُش نے ''اے بی ایم معاہدے'' کی تنسیخ کی صورت میں اُٹھایا تھا جس کی پیروی اب اوباما کر رہا ہے، پہلے بُش اور اب اوباما جن کے بعد اے بی ایم کی تنصیب عین روسی سرحد کے قریب ہو رہی ہے، مُبینہ طور پر ان ایرانی ایٹمی میزائلوں سے دفاع کے لئے جن کا وجود ہی نہیں ہے۔

آپ یقین کریں کہ اگر آپ اس خیالی مخلوق (Tooth Fairy) پر یقین رکھتے ہیں جن پر روسیوں کا کوئی یقین نہیں ہے تو ان کے پاس اس امر کا جواز ہے کہ اس کو حملے کا پہلا ہتھیار تصور

کریں۔ دفاعی حکمت عملی کے تجزیہ نگاروں کے مطابق میزائلوں کی صورت میں دفاع ہر جانب سے ہونا چاہیے۔

اس سے اگلا قدم یوکرائن کو نیٹو کی رُکنیت کی پیشکش کرنا تھا۔ یوکرائن روس کی دفاعی حکمتِ عملی میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ جارج بُش نے کیا تھا مگر اس حوالے سے اوباما اور کلنٹن نے بھی کوششیں جاری رکھیں۔

جامع قسم کا ''ٹیسٹ بین ٹریٹی''، یا ایٹمی تجربات پر پابندی کا معاہدہ کم سے کم ایٹمی تجربات کا تو اختتام کر دے گا، جو کہ ایک اہم پیشرفت ہو گی۔ تاہم اس کا نفاذ اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کی تسلسل سے عملدرآمد کی بدولت تصدیق نہیں ہو جاتی۔ تین فریق فیصلہ کن حیثیت رکھتے ہیں یعنی وہ ایٹمی ریاستیں جو اس کی تصدیق سے انکاری ہیں، یعنی چین، اسرائیل، اور امریکہ۔

بڑی ایٹمی طاقتیں، امریکہ اور روس، جو ایٹمی ہتھیاروں کے حوالے سے انتہائی غالب حیثیت رکھتی ہیں، بڑے خطرناک انداز میں ہتھیاروں کی تعداد بڑھانے کے ساتھ ساتھ ان کو جدید خصوصیات کا حامل بھی بنا رہی ہیں۔ اس میں ایک تدبیر کے طور پر نصب کردہ وہ ایٹمی ہتھیار آ جاتے ہیں جو کم درجے کی کمانڈ کے تحت میدان جنگ میں نچلی سطح یا درجے پر لائے جا سکتے ہیں، اور کسی تصادم کی صورت میں بڑی آسانی سے تیز رفتار اضافے کو یقینی بنا سکتے ہیں۔ اور روس و امریکہ کے درمیان کوئی بھی تصادم ناگزیر طور پر ہر ایک کے خاتمے کی نوید ہو گا۔ یہ کافی حد تک واضح ہے۔

اور ایسی صورتیں جہاں تصادم ناگزیر ہو جائے گا، پہلے سے زیادہ شدّت کی حامل ہونے لگی ہیں۔ عین روسی سرحد پر غور کریں کہ روسی سرحد نہ کہ میکسکو کی سرحد یہ ایک قابل غور حقیقت ہے۔ اور یہ روس کے ٹکڑے ٹکڑے ہونے کے ساتھ ہی نیٹو میں توسیع کرنے کا نتیجہ ہے۔

یہ میخائل گورباچوف کو زبانی یقین دہانیوں کی خلاف ورزی ہے، یہ یقین دہانی کہ نیٹو میں کوئی توسیع نہیں کی جائے گی۔ جملہ یوں تھا ''مشرق کی سمت ایک انچ بھی۔'' اس کا مطلب تھا

www.MashalBooks.org

مشرقی جرمنی۔ کوئی بھی اس سے آگے بڑھ کر کچھ نہیں سوچ رہا تھا کہ ''نیٹو مشرق کی سمت ایک انچ بھی آگے نہیں بڑھے گا اگر گورباچوف جرمنی کے پھر سے متحد ہونے پر رضامند ہو گیا۔''

اور ایک متحدہ جرمنی کی نیٹو میں شمولیت، ایک معاندانہ فوجی اتحاد، گذشتہ نصف صدی کی تاریخ کی روشنی میں کافی حد تک غیر معمولی قسم کی دریافت ہے، جب جرمنی نے اکیلے ہی روس کو عملی لحاظ سے دو مرتبہ ملیا میٹ کر دیا تھا۔ ہاں تو یہ ایک معاہدہ تھا مگر زبانی کلامی۔ نیٹو فوراً ہی مشرقی جرمنی کی سمت توسیع کر گیا، اور پھر کلنٹن کے دورِ حکومت میں، آگے عین روسی سرحدوں تک۔

یونیورسٹی آف ٹیکساس کے نوجوان مورخ، جوشونا شیفرنسن کی طرف سے حال ہی میں تاریخی یادداشتوں کی مدد سے کی گئی ایک تحقیق، جو کہ ایم آئی ٹی (MIT) کے جریدے ''انٹرنیشنل سیکیورٹی'' میں شائع ہوئی ہے، دیکھنے کے قابل ہے۔ وہ بڑی شدّت سے اصرار کرتا ہے کہ صدر بُش، ممبرون، مدبر سیاست دان، اور سیکرٹری آف اسٹیٹ جیمز بیکر، جو کہ گفت و شنید کر رہے تھے، ان کا انداز اس امر کی بھرپور عکاسی کرتا ہے کہ وہ گورباچوف کو جان بوجھ کر دھوکہ دے رہے تھے، ایک ایسا معاہدہ کرنے کی اداکاری کرتے ہوئے جس کی خلاف ورزی کرنے کا وہ ارادہ رکھتے تھے، ہر ممکن احتیاط کے ساتھ کہ انہیں کسی کاغذ پر دستخط نہ کرنے پڑیں۔ چنانچہ جب گورباچوف نے شکایت کی تو اسے بتایا گیا کہ یہ محض ایک زبانی و غیر رسمی قسم کا معاہدہ تھا۔

اور ان کا مفہوم یہ تھا کہ اگر آپ اتنے احمق ہیں کہ ہمارے ساتھ کئے گئے غیر رسمی معاہدے پر یقین کر لیتے ہیں، تو یہ آپ کا مسئلہ ہے نہ کہ ہمارا۔ ہاں تو، گورباچوف نے مستقبل کا ایک ایسا منظر تجویز کیا جسے اس نے ''کامن یورپین ہوم'' کا نام دیا تھا، برسلز سے ولادی وستوک، کسی بھی فوجی اتحاد سے پاک دفاعی نظام۔ یہ ایک دھندلاتا خواب ہے۔ جارج کینان اور دیگر بڑے بڑے مُدبر سیاستدانوں نے بالکل صاف صاف خبردار کر دیا تھا کہ نیٹو میں توسیع ایک ایسی کاروائی ہے جسے وہ ''ایک المناک غلطی، تاریخی سطح کا حکمت عملی کا نقص'' کہتے تھے۔ یہ تھا کینان کا نقطہ نظر۔

اور اس کا نتیجہ اب حملے کے اس روایتی راستے پر بڑھتے ہوئے اور سنجیدہ قسم تناؤ کی صورت

میں برآمد ہو رہا ہے جہاں سے گذر کر روس کو گذشتہ صدی میں عملاً صرف جرمنی نے ہی تباہ کر دیا تھا اور وہ بھی دو مرتبہ۔ ایک آخری تباہ کن ایٹمی جنگ کا خطرہ کم نہیں ہے۔ اور یہ ان دو وجوہات میں سے ایک ہے کہ یوم حشر کی گھڑی کی سوئی آدھی رات کے اتنے قریب کیوں حرکت کر رہی ہے۔

کسی حد تک انصاف کے ساتھ، یورپی مورخ رچرڈ ساکوا رقمطراز ہوتا ہے کہ اس وقت نیٹو کی بنیادی فکر یہ ہے کہ اس کے وجود کی بدولت پیدا ہونے والے خطرات کو حدود میں رکھا جائے، جو کہ بالکل درست ہے، میرے خیال میں اور یہ ارنسٹ میئر کے اخذ کردہ نتائج سے بھی مختلف نہیں ہے۔ یہ ہے وہ طریقہ جو ہم دو میں سے ایک بحران سے نمٹنے کے لئے اختیار کر رہے ہیں۔

دوسرے کون سے ہیں؟ عالمی حدّت کے بارے میں کیا خیال ہے؟ ہاں تو ہم میئر کے سوال کا جواب اس بحران سے نمٹنے کی عالمی کوششوں سے یکطرفہ طور پر علیحدہ ہونے کی صورت میں دے رہے ہیں، نہ صرف علیحدگی بلکہ ان کی کوششوں کے برعکس زوال پذیر ہونے کی طرف پوری یکسوئی سے پیش قدمی پہلے سے بھی زیادہ تیز رفتاری سے، زیرزمین ایندھن کے استعمال میں تیزی سے اضافہ کر کے، بشمول کوئلے کے، اور اس کے ساتھ ہی توانائی کے قابل تجدید ذرائع پروان چڑھانے کے لئے غریب ممالک کو امداد کے وعدے سے منحرف ہوتے ہوئے۔ اس کے علاوہ قواعد و ضوابط کے نظام کو تہس نہس کرتے ہوئے تاکہ منافع خوری میں اضافے کے ساتھ ہی ہماری بقا کو خطرات لاحق ہو جائیں۔

اور ہم اس حقیقت کی غضبنا کی پر کتنی شدّت سے اصرار کریں کہ 8 نومبر کے وقت سے امریکہ عالمی سطح پر تنہا رہ گیا ہے، اور یہ حقیقت بھی کم حیرت انگیز نہیں ہے کہ یہ غیر معمولی پیشرفت یا صورتحال نام نہاد معلوماتی نظام (Information System) میں بمشکل ہی کوئی جگہ پاتی ہے۔ اسے باقاعدہ چیختی چنگھاڑتی شہ سُرخیوں کی صورت اجاگر ہونا چاہیے تھا، اور علم دانش کی دنیا میں انتہائی نمایاں طور پر موضوع بحث ہونا چاہیے تھا، جو کہ ہماری شدید ذہنی ابتری کا اور بھی نمایاں ثبوت ہے۔ اور یہ حقیقت بھی چونکا دینے والی ہے کہ جہاں دنیا کا امیر ترین اور انتہائی طاقتور مُلک، مثالی قسم کی برتری کے ساتھ ایک امکانی تباہی کو قریب لانے کی کوششوں کی قیادت کر رہا ہے، اور جبکہ

یہ سب ہو رہا ہے، وہاں اس تباہی سے بچنے کی کوششوں کے حوالے سے وہ ممالک آگے ہیں جنہیں ہم قدیم معاشرے کہتے ہیں، کینیڈا میں صفِ اوّل کی اقوام، قبائلی اور قدیم معاشرے دیگر جگہوں پر۔

لہٰذا، مثال کے طور پر، ایکویڈور نے جہاں وسیع طور پر مقامی باشندے آباد ہیں، امیر یورپی ممالک سے امداد کی درخواست کی کہ وہ اپنے تیل کے ذخائر کو زیرِ زمین ہی رہنے دے، جہاں کہ ان کو رہنا چاہیے، گو خاطر خواہ منافع سے محرومی کی قیمت پر۔ امداد سے انکار کر دیا گیا۔ ایکویڈور نے 2008 میں اپنے آئین پر نظرِ ثانی کر ڈالی تا کہ اس میں وہ کچھ شامل کیا جا سکے جسے ''اصل قدر و منزلت رکھنے والی فطرت کے حقوق'' کہا جاتا ہے۔

یہی کچھ بولیویا میں ہوا جہاں مقامی باشندوں کی اکثریت ہے۔ اور عمومی طور پر یہی ہوتا ہے کہ ایسے ممالک جہاں پر کہ آبادی کی اکثریت بااثر مقامی باشندوں پر مُشتمل ہوتی ہے، زمین کو فطری حالت میں محفوظ رکھنے کی کوششوں میں آگے آگے ہوتے ہیں۔ جبکہ وہ ممالک جنہوں نے مقامی یا وہاں کے اصل باشندوں کو یا تو نابود کر دیا یا پھر بالکل کنارے پر لگا دیا، تیزی سے تباہی کی جانب گامزن ہیں، جو کہ شاید زیادہ قابلِ غور نکتہ ہے۔

دنیا کی تباہی و بربادی کے مرکز سے باہر، جو کہ عین اسی جگہ پر ہے، کچھ نہ کچھ کیا جا رہا ہے جو اگر چہ کسی لحاظ سے بھی خاطر خواہ نہیں مگر اتنا غیر اہم بھی نہیں ہے، اور اس امر کی نشاندہی بھی کہ کیا کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ڈنمارک کا ہدف یہ ہے کہ بیس برس کے اندر اندر بجلی کے سو فیصد قابل تجدید وسائل پیدا کر لئے جائیں۔ جرمنی میں، جو کہ ریاستی سطح پر کامیاب ترین سرمایہ دارانہ معیشت ہے، اور جہاں گذشتہ ایک عشرے کے دوران بجلی کی پیداوار کے قابل تجدید وسائل میں تین گنا اضافہ کیا جا چکا ہے، 2025 تک ان میں تقریباً نصف اضافہ کرنے اور 2050 تک 80 فی صد تک کر دینے کا ہدف مقرر کیا گیا ہے، اور یوں اس وقت تک آلودہ (Green House) گیسوں کے اخراج میں 80 یا 90 فی صد تک کمی لائی جا چکی ہو گی 1990 کی سطح کے حوالے سے۔

چین، جو کہ ابھی تک آلودگی میں بہت بڑا حصے دار ہے، شمسی توانائی کی لوحوں (Solar

Panel) کی پیدائش میں آگے آگے ہے، اور اس کے ساتھ ہی جدید شمسی ٹیکنالوجی کے فروغ میں بھی۔ اس نے کوئلے سے چلنے والے کارخانوں کو بھی بتدریج ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ امریکہ میں ریاست ہوائی نے ایک قانون منظور کیا ہے جس کے تحت یہ لازمی قرار دیا گیا ہے کہ 2045 تک بجلی کی پیداوار کے لئے تمام وسائل قابل تجدید کے زمرے میں ہوں گے۔ اور عین یہاں پر، میساچوسٹس سے تعلق رکھنے والے بہت سے ڈیموکریٹس نے ایک مسودہ قانون (Bill) پیش کیا ہے، جس کا نام ہے ایس ڈی 1932، اگر آپ اس پر نظر ڈالنا چاہیں تو، جو اس امر کا تقاضا کرتا ہے کہ ریاست میں 2035 تک توانائی کے وسائل سو فیصد تک قابل تجدید ہوں گے، اور یہ بھی ضروری قرار دیا گیا ہے کہ 2050 تک زیرِ زمین ایندھن کے استعمال کا مکمل خاتمہ کر دیا جائے، اور یوں سو فیصد قابل تجدید وسائل کو بروئے کار لایا جائے۔

سان ڈیگو کا شمار ان اولین بڑے شہروں میں ہوتا ہے جہاں 2035 تک سو فیصد قابل تجدید توانائی کے استعمال کے ساتھ ہی آلودہ گیسوں کے اخراج کی سطح بھی نصف کر دی جائے گی۔ اور یہ، حُسنِ اتفاق سے ایک دوطرفہ (Bipartisan) کوشش ہے۔ ریپبلیکن میئر نے موسمیاتی مسئلے کے حوالے سے اس عملی اقدام کی توثیق کر دی ہے جس کی متفقہ طور پر منظوری ڈیموکریٹس کے غلبے والی سٹی کونسل نے دسمبر میں دی تھی۔ یہ ہے سان ڈیگو۔

اور در حقیقت، ایسے وقت میں جبکہ فیڈرل گورنمنٹ تباہی و بربادی کا کھیل کھیلنے والوں کے ہاتھ میں ہے، ریاستیں اور شہر ابھی بھی اپنے طور پر بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ اور وفاقی حکومت بھی بہت کچھ کر سکتی اگر درست ہاتھوں میں ہوتی تو۔ چنانچہ ہیلری کلنٹن کے پروگراموں میں سے ایک یہ تھا کہ تمام گھروں کو چار برس کے اندر اندر مکمل طور پر قابل تجدید توانائی پر کر دیا جائے۔ ایسا کافی حد تک قابل عمل ہے، اور اس کی بدولت بہت سی ملازمتیں پیدا ہونے کے علاوہ موسم موافق تعمیرات اور توانائی کے وسائل محفوظ رکھنے میں بھی مدد ملے گی۔ اور حالیہ برسوں میں وفاقی قواعد ضوابط کے بعض مُثبت اثرات بھی برآمد ہوئے ہیں۔ تاہم بدقسمتی سے زیرِ زمین ایندھن کی پیداوار میں اضافے کی حمایت کر کے انہیں زائل کر دیا گیا ہے۔

www.MashalBooks.org

اوباما حکومت کی طرف سے ایک حتمی تشخیص کی گئی تھی جو کہ ''سائنس'' نامی جریدے میں کوئی دو ماہ قبل شائع ہوئی تھی۔ اس کے مطابق 2015 میں توانائی کی مکمل کھپت 2008 کی نسبت 2.5 فی صد کم تھی، جبکہ معاشی ترقی کی شرح دس فی صد تھی۔ اب یہ کمی کسی لحاظ سے بھی کافی نہیں ہے، تاہم یہ ہمیں اس امر کی یاددہانی کراتی ہے کہ شرح افزائش، بذاتِ خود، ماحول کے لئے کوئی خطرہ نہیں ہوتی۔

اس کا انحصار اس بات پر ہوتا ہے کہ افزائش کس طرح سے ہوئی۔ چنانچہ، مثال کے طور پر، ٹرانسپورٹ کا ایک معقول عوامی نظام، یا پھر توانائی کے قابل تجدید وسائل کا فروغ، یا تعلیم اور تحقیق و ترقی (R&D) کے شعبوں میں پیشرفت، اسے کہتے ہیں افزائش۔ اور اس کی بدولت بحرانوں سے نمٹنے کے امکانات بھی بڑھ سکتے ہیں، معیارِ زندگی میں نمایاں بہتری کے ساتھ ساتھ۔

اوباما کی تشخیص سے یہ پتہ چلتا ہے کہ کوئی 22 لاکھ کے لگ بھگ امریکی باشندے توانائی کی کفایت والے آلات کی مصنوعات اور خدمات کے نمونوں کی تیاری، تنصیب، اور پیداوار کے شعبے سے وابستہ ہیں، جب کہ اس کے مقابلے میں ایندھن کے زیر زمین وسائل کی پیداوار اور بجلی پیدا کرنے کے لئے ان کے استعمال کے شعبے میں اس سے آدھی تعداد مصروفِ عمل ہے۔ اور تیل کی فراواں پیداوار کے موجودہ رجحان کی بدولت، جیسا کہ میں نے پہلے ذکر کیا ہے، تقریباً کوئی بھی ملازمت پیدا نہیں ہوتی کیونکہ یہ سارا کا سارا عمل تقریباً خودکار قسم کا ہے۔ ایک بار پھر یہ کہوں گا کہ یہ اگرچہ کافی نہیں ہے، مگر غیر اہم بھی نہیں ہے، اور اس سے بھی اہم یہ کہ اس امر کی نشاندہی کرتا ہے کہ کیا کچھ کیا جا سکتا ہے۔

اور یہ سوچنے کا مناسب جواز موجود ہے کہ ایسا ہو سکتا ہے۔ ہاروے مائیکل یہاں سلون اسکول میں ریسرچ ڈائریکٹر انرجی مینیجمنٹ ہے۔ اس نے، میرے خیال میں، ترغیب آمیز انداز میں، یہ ثابت کیا ہے کہ اس وقت عالمی سطح پر زیرِ غور لائے جانے والے، یعنی امریکی ری پبلیکنز کو چھوڑ کر باقی دنیا میں زیرِ غور اقدامات بھی ہیں جو عالمی درجہ حرارت کو 2 درجے سینٹی گریڈ نیچے لانے کے ہدف کی تکمیل کر سکتے تھے۔ یہ ایک اہم خطرناک مرحلہ تصور کیا جاتا ہے۔

ارنی مونیز نے، جو ایم آئی ٹی واپس آ چکی ہے، صاف توانائی کی ٹیکنالوجی کی کم ہوتی ہوئی لاگت سے متعلق چند اعداد و شمار پیش کئے ہیں، جس کے نتیجے میں یہ حقائق سامنے آئے ہیں، جو میں یہاں اسی الفاظ میں پیش کروں گا: ''موسمیاتی تبدیلی کی بدولت ہو سکتا ہے کہ توانائی کے شعبے میں انقلاب آ گیا ہو، تاہم قیمت اسے ناگزیر بنا دیتی ہے،'' اور ہو سکتا ہے کہ وقت کا تقاضا بھی، کم سے کم مناسب کوشش کے ساتھ۔ ایندھن کے زیر زمین وسائل کی جگہ قابل تجدید وسائل کو فروغ دینا ایک اہم مسئلہ ہے۔ مگر یہ واحد مسئلہ نہیں ہے۔

حالیہ سائنسی تحقیقات کا نچوڑ پیش کرتے ہوئے، یو۔این۔ اکنامک پروگرام نے تخمینہ لگایا ہے کہ گوشت کی صنعتی پیداوار کا کل آلودہ گیسوں کے اخراج میں حصّہ 10 تا 25 فیصد ہے، اور اس کی بدولت اتنی کاربن ڈائی آکسائیڈ خارج نہیں ہوتی جتنی کہ میتھین اور نائٹرک آکسائیڈ، جو کہ دونوں ہی آلودگی پھیلانے والی گیسیں تھیں۔ تخمینوں میں فرق کا انحصار اس امر پر ہوتا ہے کہ آیا جنگلات کا صفایا اور مویشیوں کی پرورش کے حوالے سے زمین کے استعمال میں دیگر تبدیلیوں کو بھی پیش نظر رکھا گیا ہے یا نہیں۔ زراعت کی بدولت خارج ہونے والی گیسوں میں 80 فی صد تناسب مویشیوں کی افزائش وغیرہ کی سرگرمیوں کا ہوتا ہے۔

یہ زیادہ تر گوشت کی صنعتی پیداوار کا عمل ہوتا ہے، جو کہ کافی حد تک منفی اثرات کا حامل ہوتا ہے، جیسا کہ آپ کو علم ہو گا۔ اس کا مقصد زیادہ سے زیادہ منافع کمانا ہوتا ہے، اور جانوروں کو ایک کارآمد پیداواری عنصر تصور کیا جاتا ہے، نہ صرف ان پر ہیبت ناک اثرات مرتب کرنے والے عمل بلکہ آلودگی پھیلانے والی گیسوں کے اخراج میں بھی خاطر خواہ اضافے کا باعث بننے والا عمل۔ دراصل سرمایہ دارانہ دور سے قبل کی مویشی پال سرگرمی میں اتنے مسائل نہیں ہوتے تھے۔

یو۔این۔ رپورٹ سے اقتباس: ''فطری حالات میں جو کہ ہزاروں برس تک برقرار رہے اور ابھی تک دنیا میں وسیع پیمانے پر موجود ہیں، ایک متعین قسم کا گردشی نظام موجود ہوتا ہے، جس میں کہ بعض جانور اس طرح کے زمینی (قدرتی) قطعات سے چارہ حاصل کرتے ہیں جو بصورت دیگر انسانوں کے لئے بہت کم کارآمد ہوں گے۔ یوں وہ پودوں کے اندر محفوظ توانائی کو خوراک میں

www.MashalBooks.org

تبدیل کر لیتے ہیں، اوراس کے ساتھ ہی اپنے فضلے سے زمین کو زرخیزی بھی عطا کرتے ہیں۔ اگرچہ یہ پیداوار کی کوئی عمیق شکل نہیں ہوتی، البتہ اس طرح کی بقائے باہمی اور ثانوی یا غیر اہم قسم کے وسائل کا استعمال کسی زمانے میں اور بعض علاقوں میں آج بھی نباتات اور حیوانات کے علاوہ انسانی ضروریات کی تکمیل کے لئے ایک بہت ہی خوشگوار اور باہمی طور پر فائدہ مند حیاتیاتی ربط باہمی کی بہترین مثال ہے‘‘۔تاہم سرمایہ دارانہ صنعتی پیداوار اور منافع کی زیادہ سے زیادہ ہوس نے اس ساری صورتحال کو تبدیل کر کے رکھ دیا ہے۔

میں نے پہلے بھی بیان کیا تھا کہ وفاقی حکومت کے تباہ کن مشین بن جانے کے بعد، ریاستیں اور شہر اب بہت کچھ کر سکتے ہیں۔اور یہی کچھ ہم میں سے ہر ایک کے لئے درست ہے۔ تعلیم اور تنظیم کے بھی بہت سے معاملات ایسے ہیں جن کا ہمیں سامنا کرنا ہوگا۔

اور ایک مرتبہ پھر، ایک ترقی یافتہ دنیا کے اندر امریکہ کے لئے ان میں سے چندایک منفرد نوعیت کے حامل ہیں۔ایک تو وہ غیر معمولی طاقت ہے جو امریکہ میں بنیاد پرستانہ مذہبی عقائد کو حاصل ہے۔اس لئے آبادی کا چالیس فیصد حِصّہ عالمی حدّت کے خطرے کو مذہبی بنیادوں پر مسترد کر دیتا ہے۔

اُن کے نزدیک یقینی یا غالب طور پر اس امر کا امکان پایا جاتا ہے کہ دوسری آمد (حضرت عیسیٰؑ) اس مسئلے کا خاتمہ کردے گی۔ ہاں تو اس حوالے سے یہ یادرکھنا اہم ہے کہ امریکہ بعض معنوں، میں ثقافتی طور پر الگ تھلگ ہے۔دوسری جنگ عظیم سے قبل، امریکہ دنیا کی طاقتور ترین معیشت تھا، تاہم یہ سائنسی اور ثقافتی لحاظ سے دنیا کا اہم مرکز نہیں تھا۔اس لئے آپ اگر طبیعیات دان بننا چاہتے تھے تو آپ کو جرمنی جانا پڑتا تھا۔

مجھے اس صورتحال کا جزوی طور پر تجربہ اس وقت ہوا تھا جب 1955 میں میرا تقرر ایم آئی ٹی میں ہوا تھا۔میری ایک تدریسی ذمہ داری یہ تھی کہ میں سائنسدانوں اور انجینئروں کو فرانسیسی اور جرمنی میں پڑھنے کی مہارت کے امتحان میں زبردستی کامیابی حاصل کرنے میں تعاون کروں۔ یہ اس حقیقت کی نشاندہی تھی کہ جنگ سے قبل سائنسی تصانیف یہیں پائی جاتی تھیں۔

اس صورتحال کے بتدریج خاتمے یا تبدیلی میں کچھ وقت لگا۔اس وقت تک یہ سب کچھ تقریباً انگلش میں ہوگیا۔1950 کی دہائی تک یہ پرانے زمانے کی بات ہوچکی تھی۔

تبدیلی بہت حقیقی تھی، تاہم اس نے صرف ملک کے کچھ حصّوں کو متاثر کیا ہے۔زیادہ تر آبادی ابھی تک وہیں کھڑی ہے جہاں یہ قبل از جنگ دوم کے زمانے میں تھی۔اور تعلیمی نظام کے لئے یہ ایک اہم فریضہ ہے۔

اور امکانات، عین اس وقت، اتنے روشن نظر نہیں آ رہے، کم سے کم ڈی ووس سیشنز اور بینن کے تصور تعلیم کے ساتھ۔ٹرمپ حکومت نے انجیل کی تعلیمات میں یقین رکھنے والے اپنے وسیع عوامی حلقوں کے لئے کچھ نہ کچھ کرنا ہے۔اس کے لئے امریکہ کو جدید دنیا کے منظر سے اور بھی دور کر کے طالبنائزیشن کے منصوبے کے موافق کرنا ہے جو کہ اس وقت زیر تکمیل ہے۔

اس حوالے سے، بلاشبہ، اہم آزمائش درپیش ہیں۔تاہم اُمید کی چند کرنیں بھی نظر آ رہی ہیں، میں نے چندایک ایسے اقدامات کا ذکر کیا تھا جو ریاست، مقامی حکومتوں اور حتیٰ کہ پوری دنیا میں قومی حکومتوں کی طرف سے بھی کئے جا رہے ہیں تا کہ ان بحرانوں سے نمٹا جا سکے، جو اگرچہ ناکامی ہیں، مگر غیر اہم نہیں، اس امر کی نشاندہی کرتے ہوئے کہ کیا ممکن ہے۔

پُرامید ہونے کی اور بھی وجوہات ہیں۔ان میں سے ایک کی ابھی حال ہی میں خبر دی گئی ہے۔حیرت انگیز طور پر، فوکس نیوز کی طرف سے انہوں نے سیاسی شخصیات کی مقبولیت پر ایک جائزے کا اہتمام کیا۔

اور سب سے اوپر، بہت زیادہ فرق کے ساتھ، برنی سینڈرز تھا، نوجوانوں میں تو اور بھی مقبول جو کہ مستقبل کی اُمید ہیں۔مواقع کی فراوانی موجود ہوتی ہے مگر آپ نے ان کا احاطہ کرنا ہوتا ہے۔اور یہ ساری صورتحال ہمیں پھر سے ارنسٹ میئر کے سوال کی طرف لوٹ جانے پر مجبور کرتی ہے، یعنی کیا ذہین ہونا احمق ہونے سے بہتر ہوتا ہے؟ یہ آپ کے غور کرنے کے لئے سوال ہے، اور آپ پسند کریں یا نہ کریں، اس کا جواب بھی آپ کو دینا پڑے گا زیادہ تاخیر کئے بغیر۔

شکریہ۔

www.MashalBooks.org

(تالیاں)

مشعل نیوچ: (آواز نہیں آرہی) آپ کے سوالات کے لئے مائیک۔

سامعین میں سے ایک: ہیلو پروفیسر نوم چومسکی، آپ کا بہت شکریہ۔ بقا کے حوالے سے اس طرح کے تمام بحرانوں کے ساتھ، اگر آپ خود کو تقریباً بیس برس کے کسی لڑکے کے جسم میں مُنتقل کر سکتے تو آپ ان دو اقسام کے بحرانوں سے نمٹنے کے لئے کس طرح کے فیصلے کریں گے؟

نوم چومسکی: اگر میں بیس برس کا ہوتا تو؟

سامع: جی ہاں۔

نوم چومسکی: بالکل اسی طرح جب میں نے اس وقت کہا تھا جب میں سولہ برس کا تھا، 6 اگست، 1945 کو۔ اس وقت میں ایک سمر کیمپ میں جونیئر کونسلر یا مُشیر تھا۔ اور صبح کے وقت ایک خبر جاری کی گئی، ہر ایک کو نشر کردہ، کہ ایٹم بم نے ہیروشیما کا صفایا کر دیا۔

ہر ایک اپنی اگلی سرگرمی میں مصروف ہو گیا، کسی بیس بال کی طرح کے کھیل میں۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ کیسا ردِّعمل کرنا چاہیے۔ میں بس وہاں سے چل پڑا اور جنگل کی طرف روانہ ہو گیا، وہاں کوئی دو گھنٹوں تک بیٹھ کر یہی سوچتا رہا کہ یہ سب کچھ کیا تھا؟

اور بعد ازاں میں یہ فیصلہ کیا کہ دیکھو، تمہیں اپنی ساری زندگی اس (سوال پر غور کرنے) کے لئے وقف کرنی ہوگی۔ اور میرے خیال میں ہم اب اس سے بھی بدتر صورتحال میں ہیں۔ اور بہت کچھ ہے جو اس حوالے سے کیا جا سکتا ہے۔

مواقع اب پہلے سے بہت زیادہ ہیں، ان کاوشوں کے نتیجے میں جو تم جیسے لوگوں نے شروع کے برسوں میں کیں، جیسے کہہ لیں کہ ایم آئی ٹی نے کیں۔ آپ کو 20 یا 30 برس پہلے اس طرح کے سامعین نہیں مل سکتے تھے، دراصل، 1960 کی دہائی میں ایم آئی ٹی ایک بہت رجعت پسند قسم کا ادارہ تھا۔ یہاں تقریباً کچھ بھی نہیں ہو رہا تھا۔

کوئی درجن کے لگ بھگ انڈر گریجویٹ کی سطح کے طالب علموں نے یہاں عظیم تبدیلیاں برپا کر دیں، اور اس وقت سے ہی یہ جگہ بالکل تبدیل ہو کر رہ گئی ہے۔ یہی کچھ ساری ملک میں ہوا،

جس کا مطلب ہے کہ آپ کے پاس ماضی کا ایک ایسا ورثہ ہے جس کی بنیاد پر آپ مستقبل کی تعمیر کر سکتے ہیں، بے شمار آزمائشیں ہیں، مگر مواقع بھی بے شمار ہیں۔ اور سوال یہ ہے کہ آیا آپ ان مواقع کو اپنی گرفت میں لانے کا فیصلہ کرتے ہیں یا نہیں۔

سامع: بہت شکریہ۔ میں حیران ہوں نوم کہ آپ ان پیش کردہ مسائل کے حل دریافت کرنے کے امکان پر کس قدر اصرار کریں گے جو کہ امریکہ کے معاصر سیاسی نظام کے دائرہ اثر سے باہر ہیں؟ اور آپ اس سیاسی نظام سے ٹکرانے اور اسے تبدیل کرنے کی ضرورت پر کتنا زور دیں گے؟ اور آپ کے خیال میں اس نظام کو تبدیل کرنے اور ان امکانات کی راہ ہموار کرنے کے لئے ہمیں کیا کرنے کی ضرورت ہے جن کی آپ بات کر رہے ہیں؟

نوم چومسکی: بہت خوب، میرے خیال میں سیاسی نظام کی نوعیت میں خاصی اہم تبدیلی لانے کے لئے مناسب وجوہات پائی جاتی ہیں۔ میرا مطلب ہے کہ پیداوار کی تنظیم کا ایک ایسا نظام، کیا کہتے ہیں، یہیں پر اکتفا کرتے ہوئے، جو کہ صرف زیادہ سے زیادہ منافع کی طرف، بے کار، رواں دواں ہو، فطری طور پر تباہی کا ضامن ہوتا ہے۔ رسمی قسم کے اداروں کا وہ نظام جس میں کہ بنیادی سطح پر فعال ادارے مکمل طور پر آمرانہ ہوتے ہیں، کاروبار کی طرح، اوپر سے نیچے کی طرف گرفت کرتے ہوئے۔

آپ اس میں کسی نہ کسی جگہ پر موزوں ہو جاتے، اور اوپر سے احکام وصول کرتے ہیں۔ نیچے تہہ میں پڑے ہوئے، آپ خود کو معاوضے یا اجرات پر پیش کر دیتے ہیں۔ یہ فطرتاً، میرے خیال میں، انسانی اور سماجی حوالے سے تباہ کن ہے۔

چنانچہ بہت سی تبدیلیاں ہیں جو لائی جا سکتی ہیں۔ اور ہم ان کے بارے میں سوچ سکتے ہیں۔ اور درحقیقت، آپ اسی معاشرے کے اندر اس شے کے اجزا کو جوڑنے کی کوشش کر سکتے ہیں جو کہ مستقبل کے ایک زیادہ جمہوری اور انسانی منظر کی تشکیل ہو سکتی ہے۔

اور ایسا ہو بھی رہا ہے۔ تاہم آپ سیاسی نظام میں اس وقت تک کوئی بنیادی تبدیلی نہیں لا سکتے جب تک کہ آبادی کا ایک وسیع حصہ اس امر کا قائل نہیں ہو جائے کہ ہم ایک ایسی صورتحال

www.MashalBooks.org

سے دوچار ہیں جہاں کہ ایسی تبدیلیاں نہیں لائی جاسکتیں جو کہ ضروری ہیں، اور موجودہ نظام کے اندران کی مزاحمت کی جائے گی۔ اور ہم نے اس حوالے سے ابھی کوئی پیشرفت نہیں کی۔ لہٰذا، میرا نہیں خیال کہ سوال کسی عملی حیثیت کا حامل ہے۔ یہ ایک ایسے سوال کے طور پر اجاگر ہوتا ہے جو تدبیروں اور حکمت عملیوں کے چناؤ کے وقت ذہن میں آنا چاہیے۔

سامع: جناب پروفیسر۔ تو جب ہم سب اس لیکچر ہال سے نکل جائیں گے تو آپ کیا چاہیں گے کہ ہم یہاں پر آپ کی گفتگو سے کیا نتیجہ یا سبق حاصل کر کے جائیں؟ میرا مطلب ہے کہ آپ نے ہمیں غور کرنے کے لئے ایک سوال تو دے دیا مگر اس سے آگے بڑھ کر کیا کرنا ہوگا؟ اور وجہ یہ ہے کہ گذشتہ چند ماہ کے دوران موسمیاتی تبدیلی، سیاسی موسم کے حوالے سے یہاں کافی مذاکرے ہوتے ہیں، جن میں ایسے مقررین نے بھی اظہار خیال کیا، جیسے مثال کے طور پر سابق سیکرٹری آف اسٹیٹ جان گیری، اور نوبیل انعام یافتہ ماریو مولینا جس نے سی ایف سیز (مختلف گیسوں کا مرکب) دریافت کیا۔ تاہم مباحثے سے آگے بڑھ کر، عملی لحاظ سے، آپ ہم سے اور ان لوگوں سے بھی کن اقدامات کی توقع رکھتے ہیں جو فیس بک کے ذریعے شامل ہیں۔

میں جرمنی کے ایک ایسے شہر سے آیا ہوں جسے ڈوئسبرگ (Duisburg) کہتے ہیں۔ اور یہ جرمنی کی کوئلے اور فولاد کی صنعت کے مرکز میں شمار ہوتا تھا جب تک کہ گذشتہ دو برسوں میں انہوں نے توانائی کی ایسی نئی پالیسیاں متعارف نہ کردیں جن کا مقصد بنیادی طور پر ان سارے کارخانوں کو بند کردینا تھا جو ماحول کو بہت زیادہ نقصان پہنچا رہے تھے۔ اور اگرچہ اس کی بدولت جرمنی کی معیشت کوئلے اور فولاد کی پیداوار کے شعبوں میں عملاً مفلوج ہو کر رہ گئی، تاہم ماحول پر اس کے خاصے مُثبت اثرات رونما ہوئے۔

نوم چومسکی: مُثبت اثرات/فوائد کہاں سے حاصل ہوئے؟

سامع: توانائی کی ان پالیسیوں سے جن کی بدولت وہ اقتصادی طاقت کمزور پڑ گئی جو فولاد اور کوئلے کی صنعت سے حاصل ہو رہی تھی، مغربی جرمنی میں رھائن (Rhine) کے قریب (ناقابل سماعت)۔ تاہم، یہاں امریکہ میں، اگرچہ ہم کافی مباحث کر رہے ہیں کہ معیشت کے حوالے سے کیا اقدام کیا جاسکتا ہے مگر عملی طور پر کچھ نہیں۔

نوم چومسکی: ہم کیا کر سکتے ہیں؟ بہت کچھ۔

سامع: مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے پاس کرنے کو بہت کچھ ہے، زیادہ سوال توازن کا ہے۔ ہم اپنی معیشت کی کتنی قربانی دے سکتے ہیں۔ ماحول بچانے کے لئے؟ مگر پھر ہم میں سے کچھ لوگوں کے لئے مسئلہ صرف عملی قدم اُٹھانے کا نہیں ہے، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر مختلف مسائل پر بحث کرنے اور ان کے حوالے سے گفتگو کرنے کا ہے۔

نوم چومسکی: ہم کیا کر سکتے ہیں؟

سامع: بالکل، آپ کے لیکچر کا اہم تر نکتہ ہے، اس سوال پر غور کرنے کے علاوہ؟

نوم چومسکی: آپ لوگ جو یہاں ہیں، آپ کیا کر سکتے ہیں؟ ہر طرح کے کام، جن کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے، دراصل ان میں سے اکثر قابل قدر ہیں۔ جیسے، مثال کے طور پر، وہ مسودہ قانون جو میسا چوسٹس کی قانون ساز اسمبلی میں منظوری کا مُنتظر ہے۔

اگر یہ منظور کرلیا جاتا تو اس کے بہت مُثبت اثرات ہوتے۔ اس کے نتیجے میں ریاست مستقبل قریب میں توانائی کے سو فیصد قابل تجدید ذرائع کے حصول کی جانب گامزن ہوجاتی، جس طرف کہ سان ڈیگو پہلے سے ہی گامزن ہے۔ اور سان ڈیگو آزاد خیال کا کوئی اتنا بڑا پیروکار بھی نہیں ہے۔ اگر وہاں ایسا ہوسکتا ہے، تو یہاں کیوں نہیں۔

تاہم ایسا اس وقت تک نہیں ہوگا جب تک کہ اس حوالے سے دباؤ میں خاطر خواہ اضافہ نہیں ہوتا۔ میرے خیال میں تین قانون ساز ایسے ہیں جنہوں نے اسے کامیابی سے اسمبلی میں پیش کردیا تھا اور عملاً اس حوالے سے ابھی تک کچھ معلوم نہیں۔ چنانچہ ایک کام جو لوگ کر سکتے ہیں، ہزاروں میں سے ایک، وہ ایسے اقدامات کے لئے کوشش کرنا ہے جن کے نتیجے میں یہ مسودہ منظور ہوجائے نہ صرف ریاست میں، بلکہ، کیا کہتے ہیں، کیمبرج میں بھی، سان ڈیگو کی طرح۔

ایک اور کام جو آپ کر سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ بالکل براہ راست پیش قدمی کی جائے۔ حتیٰ کہ اس طرح کے سادہ کام بھی، جیسے عام لائٹ بلب کی جگہ ایل ای ڈی بلب لگا دینا، توانائی کی

پیداوار کے عمل پر اہم اثرات مرتب کرتے ہیں۔اور ایسے کام کئے جاسکتے ہیں۔اسے کافی نمایاں پیمانے پر کرنے کے لئے تنظیم اور تحریک کی ضرورت ہوتی ہے۔تاہم یہ ایک ایسا کام ہے جو آپ بھی کر سکتے ہیں۔

جیسا کہ میں نے ذکر کیا ہے، مُلک کا مقبول ترین اُمید وار اور سیاسی شخصیت برنی سینڈرز ہے، جو خاص طور پر نوجوانوں کی اکثریت کو پسند ہے۔اتنی مقبولیت کہ وہ اپنی مخالفت کو انقلاب قرار دیتا ہے۔تاہم وہ اس امر کی نشاندہی کرتی ہے کہ ملک کس حد تک دائیں بازو کے رجحانات کا حامل ہو چکا ہے۔

دراصل، اس کی پالیسیاں آئزن ہاور کو خاص طور پر قابل قبول ہوتیں۔حقیقت میں، اگر آپ ماضی کی طرف جا کر آئزن ہاور کے ''نیوڈیل'' کے حوالے سے تبصرے کے مطالعہ کریں، تو اس کا کہنا تھا کہ کوئی بھی فرد جو ''نیوڈیل'' کی پالیسیوں پر اعتراض کرتا ہے اُس کا سیاسی نظام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔یہ اب تقریباً ہر کسی کے بارے میں کہا جاسکتا ہے، ماسوائے اس کے کہ سینڈرز نیوڈیل کے تحت پالیسیوں کا مطالبہ کر رہا ہے۔

انجمنوں، مزدور انجمنوں کی اہمیت کے حوالے سے آئزن ہاور کے بیانات کا آج کے دور میں تقریباً تصور بھی نہیں کیا جاسکتا، مگر درست ہیں۔اور یہ 1950 کی دہائی میں دایاں بازو ہے، تو ہاں، ہم منظر کو پیچھے کی طرف کر کے ان دنوں تک پہنچ سکتے ہیں جب سماجی جمہوری پالیسیاں جائز تصور کی جاتی تھیں، اور آپ اس سے بھی آگے کی طرف جاسکتے ہیں۔

2018 میں بھی ایک الیکشن ہونا ہے۔ڈیموکریٹس، اپنی ناکامیوں کی پیچ میں ضروری طور پر اوباما ڈیموکریٹس ہی رہے ہیں، بنیادی طور پارٹی کو تباہ کرتے ہوئے۔اب کچھ بھی، تقریباً کچھ بھی نہیں رہا ماسوائے صدارتی سطح کے۔

گریبز کا بھی بالکل یہی مغالطہ ہے۔ان کی توجہ کا مرکز صدارتی، اور چار سالہ تعیش رہا ہے، مگر اُنہوں نے مقامی سطح پر، یعنی اسکول بورڈز، ریاستی قانون ساز اداروں، سٹی کونسلز، گورنروں، اور پورے کے پورے نظام کی سطح پر پارٹی کی بنیادوں کی تعمیر نہیں کی، جیسا کہ اس کا اپنی جگہ پر

ہونا ضروری ہے اگر آپ کوئی تبدیلی لانا چاہتے ہیں تو کاچ (Koch) برادرز کو اس کی سمجھ آ گئی تھی۔ دائیں بازو والوں کو بھی سمجھ آ گئی ہے، اور انہوں نے دراصل اقلیتی بنیاد پر بھی ایسا نظام تعمیر کر لیا ہے۔ایسا اگرچہ اکثریتی بنیاد پر نہیں کیا گیا مگر ایسا یقیناً کیا جاسکتا ہے۔

اب، کیا کہتے ہیں، امدادِ باہمی کی انجمنوں، یا کارکنوں کی ملکیت والے اداروں کے قیام کا آغاز ہو چکا ہے جو کہ خود کارکن چلائیں گے۔یہ ایسے کام ہیں جو نہ صرف یہ کہ کئے جاسکتے ہیں، بلکہ کئے بھی جا رہے ہیں۔امکانات کا ایک پورا سلسلہ ہے، ایسے امکانات جن کا آپ پیچھا کر سکتے ہیں، اگر چاہو تو، اگر آپ ایسا کرنا پسند کریں تو۔کرنے کے لئے کسی ہدف کی کمی نہیں ہے۔

سامع: آپ کو سُن کر بہت مُسرت ہوئی۔میں ذرا موضوع سے پرے چلا گیا ہوں، تاہم میرا نہیں خیال کہ مجھے کبھی آپ سے یہ سوال کرنے کا موقع پھر ملے گا۔آپ کا ہمارے یہاں انتخابی عمل میں کریملن (روس) کی مداخلت کے حوالے سے کیا خیال ہے۔

نوم چومسکی: معذرت کے ساتھ کہوں گا کہ میں نے سُنا نہیں۔اگر کوئی مجھے بتا سکے تو۔

سامع: ہمارے انتخابات میں روس، کریملن کی مداخلت، 2016 کے انتخابات میں۔

نوم چومسکی: معذرت کے ساتھ پھر کہوں گا کہ میں نے نہیں سُنا۔

سامع: روسی مداخلت، مُبینہ طور پر ہمارے انتخابات میں۔

نوم چومسکی: اچھا، ہمارے یہاں انتخابی عمل میں روسی مداخلت۔یہ بات سُن کر ساری دنیا ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو رہی ہے۔

(تالیاں)

لغوی معنوں میں، فرض کریں کہ ہر الزام درست ہے۔چلیں فرض کرتے ہیں کہ انتہائی سنجیدہ نوعیت کے الزامات بھی درست ہیں۔یہ حتیٰ کہ لطیفہ بھی نہیں لگتا اگر ہم وہ کچھ پیشِ نظر رکھیں جو ہم مسلسل کرتے چلے آ رہے ہیں۔

(تالیاں)

آپ آئینے کی مثال لے لیں، ہم روسی انتخابات کے ساتھ کیا کرتے ہیں۔90 کی دہائی شروع

میں جب یلسن کلنٹن کا منظورِ نظر تھا تو مفروضہ طور پر اسے مستقبل کی اُمید تصور کیا جاتا تھا۔ جب اس نے پارلیمنٹ کو ملیا میٹ کرنے کے ساتھ ہی رسمی جمہوری نظام کی بساط لپیٹ ڈالی تو اسے امریکہ کی زبردست پُشت پناہی حاصل تھی۔ 1996 میں جب وہ عدم مقبولیت کی انتہائی حدوں کو چھو رہا تھا، جس کی معقول وجوہات تھیں، کیونکہ جھٹکوں کے ساتھ علاج نے، ایک طرح سے آزاد منڈی کی ایسی پالیسیاں جو امریکی مشیروں کی مُسلط کردہ تھیں، معیشت کا بیڑہ غرق کرنے کے علاوہ لاکھوں لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔

یہ انتہائی تباہ کُن تھا۔ اس کے نتیجے میں گروہی اجارہ داریوں (Oligarchs) کو فروغ ملا، جن میں سے اکثر کمیونسٹ نظام میں سابقہ کارکن اور مخبر لوگ تھے جو وسائل کی چوری میں ملوث تھے۔ یہ ایک مکمل تباہی تھی۔ اور یلسن اس کی علامت تھا۔

کلنٹن اس حوالے سے کھلے بندوں کام کر رہا تھا۔ کوئی شے خفیہ نہیں تھی، سب کچھ عیاں تھا، قرضوں سے لے کر مشوروں اور براہ راست ملوث ہونے تک یہ کوشش کرتے ہوئے کہ ان کا پسندیدہ امیدوار منتخب ہو جائے۔ یہ تھا 1996۔

اور یہ چھوٹی چھوٹی مثالیں ہیں۔ جو کام ہم مسلسل کرتے ہیں وہ ہے حکومت کا تختہ الٹنا، کوئی فوجی آمریت مُسلط کرنا، اور یہ ماضی قریب کی مثالیں ہیں۔ 2009 میں ہنڈوراس میں اوباما کے دورِ حکومت میں بھی ایسا ہوا تھا۔

وہاں ایک نرم قسم کی اصلاحی حکومت تھی۔ امیر ترین لوگوں کا مختصر حلقہ جو مُلک چلا رہا تھا اس صورتحال سے نالاں تھا۔ اس حکومت کا فوجی بغاوت کے ذریعے خاتمہ کر دیا گیا۔ امریکہ ان بہت تھوڑے ممالک میں سے ایک ہے جنہوں نے اس (بغاوت) کی حمایت کرنے کے ساتھ ہی یہ دعویٰ بھی کیا تھا کہ آمرانہ فوجی حکومت کے زیرِ انتظام ہونے والے انتخابات جائز تھے۔

اس کا مطلب بنیادی طور پر ایک پارلیمانی حکومت کا تختہ اُلٹنے والی فوجی بغاوت کی حمایت کرنا ہوتا ہے۔ کیا یہ انتخابات میں مداخلت ہے؟ آپ کو علم ہو گا کہ یہ سلسلہ جاری رہتا ہے، اسی طرح۔ تو جیسا کہ میں نے بتایا ہے، یہ امریکہ کو پوری دنیا میں مذاق کا نشانہ بنانے کے مترادف

ہے، چاہے، عائد کردہ ہر ایک الزام درست ہی کیوں نہ ہو۔ ان میں سے اکثر الزامات بے بنیاد ہیں۔

سامع: شکریہ۔

سامع: تو اس وقت موسمیاتی تبدیلی کے حوالے سے جو کہ انسانی وجود کے لئے خطرہ ہے ذرائع ابلاغ میں جو خاموشی چھائی ہوئی ہے، وہ کان پھاڑ دینے والی۔ اور آپ نے اس کے حوالے سے اپنی ایک کتاب میں وضاحت پیش کی ہے، جس کا عنوان ہے ''مینوفیکچرنگ کونسنٹ''، یہ کہ کچھ ایسی پابندیاں ہیں جو قابلِ قبول سیاسی مباحثے کی حدود کو وسیع نہیں ہونے دیتیں۔ میں حیران ہوں کہ، ویسے تو یوں لگتا ہے کہ ممکن ہے ان حالیہ انتخابات میں اس طرح کی چند رُکاوٹوں (Filters) کا انٹرنیٹ کے بڑھتے ہوئے استعمال اور زیادہ جمہوری عوامی ذرائع ابلاغ کی بدولت احاطہ کیا جا رہا ہو۔ آپ کا کیا خیال ہے کہ ٹرمپ کا انتخاب، برنی سینڈرز کا سرکش بنیادی حلقہ (Primary)، اور بڑے بڑے ذرائع ابلاغ کی طرف سے جعلی خبروں اور سچائی کے خاتمے کے حوالے سے اچانک شور و غل اس امر کی علامت ہیں کہ ہو سکتا ہے جھوٹی تشہیر کا یہ نظام اب زوال پذیر ہو رہا ہو؟ اور اگر ایسا ہے تو پھر اس کا ہمیں درپیش بقا کے خطرات سے متعلق ایک طرح کی خاموشی توڑنے کی صلاحیت کے حوالے سے کیا مطلب بنتا ہے؟

نوم چومسکی: میرے خیال میں یہ بہت اہم ہے۔ اگر آپ سینڈرز کی انتخابی مہم پر نظر ڈالیں تو پتہ چلے گا کہ اس حوالے سے اتنا مباحثہ نہیں کیا گیا جتنا کہ کیا جانا چاہیے تھا، تاہم یہ خاصی حد تک چونکا دینے والی کامیابی تھی۔ میرا مطلب ہے کہ، ایک صدی سے بھی زائد عرصے سے امریکہ کے انتخابات میں پیسے کے اثر و رسوخ کا سلسلہ چلا آ رہا ہے، اور اس کا اچھا خاصا ثبوت موجود ہے۔

اس حوالے سے سب سے زیادہ تحقیق ٹام فرگوسن نے کی ہے جو یوماس (UMass)، بوسٹن میں سیاسی شعبے کا ماہر ہے اور ایم آئی ٹی میں بھی کام کرتا رہا ہے۔ اس کی ایک کتاب کا عنوان ہے ''گولڈن رول''، جس میں صرف اور صرف انتخابات کے نتائج پر انتخابی مہم میں سرمایہ کاری کے کردار کا اور ان پالیسیوں کا جائزہ لیا گیا ہے جن کا آغاز انیسویں صدی سے ہوا تھا، براہ راست

www.MashalBooks.org

نیوڈیل کی وساطت سے، وغیرہ وغیرہ۔ اوراس کے حیرت انگیز نتائج۔

کوئی دو ماہ قبل اس کا ایک مقالہ منظرِ عام پر آیا جس میں 1980 کے لگ بھگ سے لے کر اس وقت تک کانگرس کے انتخابات کا جائزہ لیا گیا ہے، اور انتخابی مہم میں سرمایہ کاری اور مُنتخب ہونے کی اہلیت کے درمیان تعلق کا بھی۔ یہ ایک طرح سے سیدھی لکیر کی طرح ہے۔ آپ کو سماجی علوم کے شعبے میں اس طرح کے نتائج نہیں ملتے۔

اوراس میں کچھ بھی نیا نہیں ہے۔ میرا مطلب ہے 1895 کے زمانے میں مہم کا انتظام کرنے والی ایک زبردست شخصیت ہوتی تھی جس کا نام تھا مارک حنا۔ اور ایک مرتبہ اس سے سوال کیا گیا تھا کہ ایک کامیاب سیاسی مُہم چلانے کے لئے کس چیز کی ضرورت ہوتی ہے؟ اُس نے جواب دیا کہ بہت خوب، آپ کو دو چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک تو پیسوں کی، اور جو دوسری چیز اس نے بتائی تھی وہ مجھے بھول گئی ہے۔ وہ 1895 کا زمانہ تھا۔ اس کے بعد سے صورتحال مزید شدت اختیار کر چکی ہے۔ اوراس وقت تو نظروں سے ہی اوجھل ہو چکی ہے۔

اس کے کوئی ایک صدی سے بھی زیادہ عرصہ گذر جانے کے بعد، کوئی آتا ہے جس کے متعلق کسی نے بھی کچھ نہیں سنا ہوتا۔ وہ خوفزدہ کر دینے والا لفظ بولتا ہے، ''سوشلسٹ''۔ اس کے پاس کوئی عطیات نہیں ہوتے، بڑے کاروباری اداروں سے اور نہ ہی دولت مند افراد سے کچھ ملتا ہے۔ لوگ فوراً ہی اس کے مخالف ہو جاتے ہیں، مکمل طور پر، یا تو اس کا تمسخر اُڑاتے ہوئے یا پھر اسے مسترد کرتے ہوئے۔

وہ ڈیموکریٹک کے لئے بڑی آسانی سے نامزد ہو سکتا تھا، اگر پارٹی اسے باہر رکھنے کے لئے کسی طرح کی کارستانیاں نہ کرتی۔ یہ کافی حد تک حیران کُن پیشرفت ہے۔ اوراس سے جو کچھ ظاہر ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ ادارے بظاہر تو طاقتور نظر آتے ہیں مگر عوام جونہی شریک عمل ہوتے ہیں تو اس وقت یہ ادارے خستہ حال ہو کر رہ جاتے ہیں۔

ادارے بنیادی طور پر بہت کمزور ہوتے ہیں۔ یہ دراصل ایک ایسا گہرا ادارک ہے جو کوئی سو برس قبل شروع ہوا تھا۔ سیاست کے حوالے سے ڈیوڈ ہیوم کی تخلیقات کا شمار اس نوعیت کی اولین

تخلیقات میں ہوتا ہے، جو کہ ایک عظیم فلسفی اور کلاسیکی آزاد خیالی (Classical Liberalism) کا بانی تھا۔ اس کی ایک تحقیق کا عنوان ہے، ''فرسٹ پرنسپلز آف گورنمنٹ''۔

اور وہ اس کا آغاز یہ کہہ کر کرتا ہے کہ حکومتیں عجیب تضاد/ تناقص کا شکار ہوتی ہیں۔ اس کے مطابق ہر حکومت میں، خواہ وہ فوجی انتظام کے تحت ہو، کم یا زیادہ مقبول جیسے اس دور کے انگلینڈ میں، عجیب بات یہ ہوتی ہے کہ لوگ حکمرانوں کی اطاعت کرتے ہیں۔

اور وہ ایسا کیوں کرتے ہیں؟ کیونکہ طاقت و اختیار حکومت کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ اور اگر وہ چاہیں تو وہ اسے حاصل کر سکتے ہیں۔

اور وہ یہ کہتا ہے کہ یہ مقصد کس معجزے کی بدولت حاصل کیا جاتا ہے؟ اس کا کہنا ہے کہ صرف عوامی رائے پر گرفت کی بدولت۔ اگر آپ لوگوں کو یہ احساس دلا سکیں کہ وہ بے بس ہیں اور سب کچھ فضول ہے، اور وہ کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ تو پھر وہ اطاعت کریں گے۔ اگر ایسا نہیں ہو گا تو پھر وہ اطاعت نہیں کریں گے۔

اور یہ کافی حد تک ہماری طرح کے آزاد ممالک میں زیادہ درست ہے، بہ نسبت، کیا کہتے ہیں، فوجی آمریتوں کے۔ تاہم تضاد یا تناقص ایک حقیقت ہے اور یہ لوگوں کے اختیار میں ہوتا ہے کہ اس کو دور کریں۔

اور سینڈرز کی فہم اس صورتحال کی ایک ڈرامائی عکاسی ہے۔ اور آپ کا متبادل ذرائع ابلاغ کے بارے میں کیا خیال ہے، یہ بھی ایسا کر سکتے ہیں اگر سب کچھ مناسب طریقے سے کیا جائے تو۔ اور پھر عوامی ذرائع ابلاغ بھی اس سے متاثر ہوتے ہیں، کیونکہ انہوں نے اس پر ردعمل کرنا ہوتا ہے۔ تو ثابت ہوا کہ اداروں کی سطح پر ساخت بنیادی طور پر بہت کمزور ہے، اور اسے آسانی سے تبدیل کیا جا سکتا ہے۔

سامع: شکریہ۔

سامع: اور جناب، میں اس ملک کے اہم اداروں کا اپنے نظامِ حکومت، اور خاص طور پر اعلیٰ تعلیم کے اداروں اور موسمیاتی تبدیلی وغیرہ کی عظیم آزمائش سے نمٹنے کی ان کی صلاحیت کے حوالے سے

www.MashalBooks.org

پر امید رہنا چاہتا ہوں تاہم بعض اوقات میں یہ سوچ کر حیران ہوتا ہوں کہ آیا ہمیں واقعی کسی ڈرامائی تبدیلی کی ضرورت ہے۔ جب میں اعلیٰ تعلیم کے اداروں کے بارے میں سوچتا ہوں، اس دنیا کے بارے میں جس میں کہ میں رہتا ہوں، زیادہ تر، تو آپ کا کیا خیال ہے کہ آیا مکمل طور پر نئی ساختیں اور ایسی حکمتِ عملیاں موجود ہیں جن کو تخلیق کرنے کی ہمیں کوشش کرنی چاہیے تاکہ موجودہ مسائل سے نمٹا جا سکے؟ کیونکہ شاید بتدریج یا مرحلہ وار اقدامات اتنے کارآمد نہ لگ رہے ہوں۔

نوم چومسکی: میرے خیال میں ہم میں سے کوئی بھی اگر یوں کر سکے کہ کافی شاپ میں بیٹھے اور اس دنیا کے معاملات کو بہت بہتر طریقے سے چلانے کی تجاویز پر غور وفکر کرے، زیادہ بہتر ادارے، زیادہ جمہوری، زیادہ منصفانہ وغیرہ وغیرہ۔ تاہم اس حوالے سے محض سوچنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ آپ کا عوام کی اکثریت کو ایسے اداروں کی تخلیق کے حوالے سے ایک عزم ظاہر کرنے پر آمادہ کرنا ہوگا۔

اور آپ یہ سب کچھ مرحلہ وار کر سکتے ہیں۔ آپ کو اس نظام کے اندر رہ کر کام کرنا ہوگا جو اس وقت موجود ہے۔ آپ اس کے اندر رہ کر بھی بہت کچھ کر سکتے ہیں۔

آپ ایک ایسے مستقبل کا تصور کر سکتے ہیں جو لوگوں کو مزید پیشرفت کے حوالے سے رہنمائی فراہم کر سکے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ، جیسا کہ میں نے پہلے ذکر کیا ہے، آپ اس نظام کے اندر بھی مستقبل کے ادارے تعمیر کر سکتے ہیں، مثلاً امدادِ باہمی کے ادارے، کارکنوں کی ملکیت کے حامل ادارے۔ اگر ان کو توسیع دی جائے گی تو معاشرے میں عظیم تبدیلی برپا کر دیں گے۔ اور یہ ایسی چیزیں ہیں جو مسلسل اجاگر ہوتی رہتی ہیں، اگر آپ مواقع سے فائدہ اٹھانے کے لئے تیار ہوں تو۔

چنانچہ، 2008 کے دھچکے یا اچانک آنے والی تباہی کی مثال ہی لے لیں۔ اس وقت ایک چیز جو واقع ہوتی تھی، جو کافی حد تک دلچسپ تھی، وہ یہ تھی کہ حکومت نے ناگزیر طور پر گاڑیوں کی صنعت کو قومیا لیا، بلکہ بنیادی طور پر دیوالیہ ہونے سے بچا لیا۔ یہ صنعت معدوم ہونے لگی تھی۔ چنانچہ حکومت نے، مطلب یہ کہ محصولات ادا کرنے والے تمام شہریوں نے گاڑیوں کی صنعت

خرید لی۔

اور پھر چند ایک اور متبادل راستے بھی تھے جن کا چناؤ کیا جا سکتا تھا۔ ایک تو وہ جس کو کسی بحث مباحثے کے بغیر چنا گیا، یعنی یہ کہ اسے واپس اس کے سابقہ مالکان کے سُپرد کر دیا جائے ہو سکتا ہے کہ چہرے نئے ہوں، مگر بینک والے وہی ہوں گے اور وغیرہ وغیرہ۔ لہٰذا ضروری طور پر اسے سابقہ مالکان کے حوالے کر دیا جائے تاکہ وہ عین وہی کچھ کرتے رہیں جو کہ ہو رہا تھا، یعنی کاریں بنانے کا کام۔

ایک اور امکان بھی تھا، اسے کارکنوں کے حوالے کر دیا جائے۔ ان کے لئے گنجائش رکھی جائے کہ وہ اس جمہوری طریقے سے چلاتے اور سماج کی ضرورت کے مطابق پیداوار کرتے رہیں۔ اور یہ ضرورت زیادہ کاروں کی نہیں بلکہ عوام کے لئے ٹرانسپورٹ کے ایک معقول نظام کی ہے۔ یہ ایک اور امکان تھا۔

تاہم، اس پر عملدرآمد کے لئے آپ کو وسیع عوامی حمایت کی ضرورت تھی۔ اور ایسی کوئی صورتحال نہیں تھی، اس لئے یہ نہ ہو سکا۔ اور اس طرح کی چیزیں حتیٰ کہ عین مقامی سطح پر بھی اس علاقے میں واقع ہوتی ہیں۔

کوئی دو برس قبل کی بات ہے، بوسٹن کے نواحی علاقے ٹاٹن میں ایک چھوٹا سا کارخانہ ہوتا تھا جو کہ بہت کامیاب تھا، ایک ایسا کارخانہ جو ہوائی جہازوں کے لئے معیاری پُرزے ساخت کر رہا تھا۔ یہ اس کثیر القومی کمپنی کے لئے اتنا منافع نہیں کما رہا تھا جو اس کی لاگت تھی کہ وہ اسے جاری رکھ سکے۔ چنانچہ اسے بند کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا۔

مزدور انجمن، ترقی پسند انجمن، یو ای نے اس کارخانے کو خریدنے کی پیشکش کر دی کہ اسے کارکنوں کی مدد سے چلایا جائے گا، جو کہ اس کثیر القومی کمپنی کے لئے فائدہ مند (پیشکش) ثابت ہوتی۔ تاہم، طبقاتی وجوہات کی بنا پر اس طرح کی چیزوں کو پسند نہیں کیا جاتا۔ اگر عوامی سطح پر حمایت حاصل ہوتی تو پھر ایسا ہو جاتا۔

چونکہ ایسی کوئی حمایت موجود نہیں تھی اس لئے انجمن کو کامیابی نہ ہوئی۔ اسی طرح کی

www.MashalBooks.org

صورتحال ہر وقت اجاگر ہوتی رہتی ہے۔اور اگر ان سے استفادہ کیا جائے تو معاشرے میں اہم تبدیلیاں رونما ہوسکتی ہیں۔

کیا یہ بتدریج رونما ہوتی ہیں؟ ایک مفہوم میں، تاہم ان کے دیر پا اثرات بہت ہی زیادہ فائدہ مند ہوسکتے ہیں۔اور یہی کچھ ہر طرح کی چیزوں کے بارے میں کہا جاسکتا ہے۔

سامع: بہت شکریہ، ہمیں اس طرح کچھ اور مواقع بھی حاصل کرنے چاہئیں۔

مشعل نیوچ: میرے خیال میں ہمارے پاس ایک اور سوال کے لئے وقت ہے۔

سامع: محترم حاضرین، میرے پاس (ناقابل سماعت) سوال ہے ہر اس شخص کے لئے جو یہاں موجود ہے دراصل۔ بہت بہت شکریہ۔ پہلا سوال یہ ہے کہ اس کمرے میں موجود کتنے لوگ ایسے ہیں جن کے پاس کوئی کار ہو؟

نوم چومسکی: معذرت؟

سامع: اس کمرے میں موجود کتنے لوگوں کے پاس کار ہے؟ اور آپ میں سے کتنے لوگ اپنی کار کو گرم کرنے کے لئے اسے کم سے کم پانچ منٹ کے لئے چلاتے ہیں جبکہ آپ ابھی تیار ہو رہے ہوں؟ آپ میں سے کتنے لوگ کاغذ یا پلاسٹک کی تھیلیاں استعمال کرتے ہیں؟ اور آپ میں سے کتنے لوگ ہیں جو اپنا سیل فون ہر برس تبدیل کرتے ہیں؟

تو ماحول دوست بننے کے لئے یہ ضروری ہوتا ہے کہ ہم ان غلطیوں سے آگاہ ہوں جو ہم کرتے ہیں۔اور میں یہاں موجود ہر شخص کو یہ یاد دہانی کرانا چاہوں گا کہ تبدیلی ان لوگوں کی طرف سے چھوٹے چھوٹے مراحل طے کرنے کا نام ہے جو خیال کرتے ہیں۔ہمیں یہ ظاہر کرنا ہوگا کہ ہم ماحول کا خیال کرتے ہیں۔اور ہمیں اس حوالے سے بھی سوچنا چاہیے کہ ہم کیا خریدتے اور کیا صرف کرتے ہیں۔

(تالیاں)

نوم چومسکی: میں معذرت خواہ ہوں۔

مشعل نیوچ: میرا اندازہ ہے کہ آپ کے لئے کوئی سوال باقی نہیں رہا۔ میں ''سنٹر فار انٹرنیشل

سٹڈیز'' کی طرف سے ہر ایک کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گی کہ آپ نے اس تقریب میں شرکت کی۔ اور، مہربانی کرکے نوم چومسکی کو شکریہ کہنے کے لئے میرے ساتھ ہم آہنگ ہوجائیں۔

(تالیاں)

نوم چومسکی: شکریہ۔

ماخذ:

https://www.youtube.com/watch?v=Z5A8BVrjRfU

www.MashalBooks.org

6- ''ہمیں ایک بہت عظیم فریضہ درپیش ہے اور وقت بہت کم رہ گیا ہے''

نوم چومسکی کے ساتھ ایک انٹرویو، 12 جولائی، 2019

نوے برس کی عمر میں قدم رکھنے کے بعد بھی نوم چومسکی ہمیں ابھی تک اپنے بصیرت آموز افکار سے نواز رہے ہیں۔ یہاں وہ موسمیاتی تبدیلی، امریکی شہنشاہیت، یہود مخالف نظریات، وینز ویلا اور دیگر بہت سے موضوعات پر اظہار خیال کریں گے۔

موسمیاتی تبدیلی کی یورش سے لے کر عالمی سطح پر دائیں بازو کی شدّت پسند تحریکوں، ایٹمی ہتھیاروں کے پھیلاؤ میں اضافے تک، قدرتی ماحول، اور جمہوری اداروں کو درپیش خطرات مسلسل حقیقت ثابت ہونے کے ساتھ ہی بحران کا احساس نمایاں ہوتا جا رہا ہے۔ اس طرح کی تیز رفتار تبدیلیوں کے حصار میں ہونے کے باوجود نوم چومسکی عالمی سیاست اور اس کی ان باریکیوں کے فہم کے حوالے سے ناگزیر چلا آ رہا ہے جن سے اکثر تجارتی ذرائع ابلاغ (Corporate Media) بھی لاعلم ہوتے ہیں۔

ادراکی سائنس اور لسانیات کے شعبوں میں اس کی نظیر تبدیل کر کے رکھ دینے والی خدمات کے علاوہ بہت سے لوگ چومسکی کو امریکی خارجہ پالیسی، مغربی ذرائع ابلاغ کے ''تشہیری نمونے''، اور حال ہی میں انسانی سرگرمیوں کے موسمیاتی تبدیلی پر بڑھتے ہوئے اثرات کے زبردست ناقد

کے طور پر جانتے ہیں۔ اب نوے برس کی عمر میں قدم رکھنے کے بعد بھی چومسکی نے پڑھانے، لکھنے، اور لیکچر دینے کے علاوہ حیرت انگیز طور پر بے شمار انٹرویو دینے کا سلسلہ جاری رکھا ہوا ہے۔ اس کی تازہ ترین کتابوں میں درج ذیل شامل ہیں:

Global Discontents: Conversations on the Rising Threats to Democracy (Penguin,2017), *Requiem for the American Dream The 10 principles of Concentration of Wealth & Power* (Seven Stories Press, 2017), and *Why Only Us: Language and Evolution* (MIT Press, 2016)

ہیریسن سیمفر نے حال ہی میں اس معروف منحرف (Dissident) اور فلسفی سے موسمیاتی تبدیلی، وینز ویلا، ایران، یہود مخالف نظریات، امریکی شہنشائیت، اور دیگر موضوعات پر تبادلہ خیال کیا۔ صراحت اور طوالت کے پیش نظر ان کی گفتگو کا اختصار پیش کیا جا رہا ہے۔

ہیریسن سیمفر: نیشنل اوشنک اینڈ ایٹموسفیرک ایسوسی ایشن (NOAA) کے حساب سے اگر آلودہ گیسوں کے اخراج میں کوئی کمی نہ آئی تو 2100 تک سطح سمندر میں 8 فٹ سے زائد کا اضافہ ہو جائے گا۔ اس کے اثرات کی لپیٹ میں لازمی طور پر دنیا کے غریب ترین اور انتہائی غیر محفوظ زندگی گذارنے والے لوگ آئیں گے۔ کیا آپ کے خیال میں کوئی ایسا امکان ہے کہ ہم اس صورتحال سے بچ سکیں؟

نوم چومسکی: اگر اس طرح کی کوئی صورتحال وقوع پذیر ہوتی ہے تو آفت یا تباہی اس سطح پر ہو گی کہ اس کا تصور بھی تقریباً تقریباً ناممکن ہے، اور اگرچہ، جیسا آپ نے کہا ہے غریب ترین اور غیر محفوظ ترین لوگوں کے لئے یہ انتہائی شدید ہو گا، تاہم باقی ماندہ معاشرے کے لئے بھی انتہائی خوفناک اور یہ رواں تخمینہ ہی نہیں ہے جو کہ انتہائی دہشت ناک ہے۔ ہم عالمی حدّت کی تقریباً تقریباً اس ہولناک سطح کے قریب پہنچنے والے ہیں جو 125000 برس قبل تھی جبکہ سطح سمندر آج کی نسبت 6 تا 9 میٹر بلند تھی، اور قطب جنوبی کے سمندر کی برف کے تیزی سے پگھلنے کی بدولت اس فرق (Gap) میں

اور بھی کمی کا خطرہ ہے، ممکنہ طریقے سے بڑھتی ہوئی رفتار کی بدولت، جیسا کہ بعض حالیہ جائزوں سے نشاندہی ہوتی ہے۔

کیا اس سطح پر ہونے والی تباہی سے بچنے کا کوئی امکان ہے؟ بلاشبہ۔اس حوالے سے بہترین طور پر تیار کردہ اور معقول تجاویز موجود ہیں؛ معیشت دان رابرٹ پولن کی ''گرین نیوڈیل'' پر کی گئی تحقیق میرے علم کے مطابق بہترین ہے۔تاہم درپیش فریضہ بہت ہی عظیم نوعیت کا ہے اور وقت بہت کم رہ گیا۔حتیٰ کہ اگر ساری ریاستیں مل کر بھی اس پر قابو پانے کی مخلصانہ کوشش کریں، آزمائش پھر بھی بہت بڑی ہوگی۔بعض ریاستیں سنجیدہ ہیں۔تاہم اس حقیقت کو نظرانداز کرنا بھی ناممکن ہے کہ انسانی تاریخ کی طاقت ورترین ریاست ایسے لوگوں کی قیادت کے تحت کام کر رہی ہے جنہیں کہ عین درست الفاظ میں ایسے بڑے بڑے مجرموں کا ٹولہ کہا جا سکتا ہے جو بغیر سوچے سمجھے تیزی سے ڈھلوان کی طرف دوڑ لگا رہے ہوں۔

اور وہ جس سطح پر جرائم کی منصوبہ بندی کر رہے ہیں اس کا الفاظ میں احاطہ کرنا بھی انتہائی مُشکل ہے۔ایک چھوٹی سی مگر نمایاں مثال ماحول کے حوالے سے کی گئی 500 صفحات کی وہ تشخیص ہے جو ٹرمپ کی نیشنل ہائی وے ٹریفک سیفٹی ایڈمنسٹریشن نے تیار کی تھی، گاڑیوں سے دھوئیں کے اخراج کے لئے معیاری پیمانوں کو منسوخ کرنے کا مطالبہ کرتے ہوئے۔ان کی دلیل بہت معقول ہے۔تحقیق میں تخمینہ لگایا گیا ہے کہ صدی کے اختتام تک حرارت کے درجوں میں 4 ڈگری سینٹی گریڈ کا اضافہ ہو جائے گا۔گاڑیوں سے نکلنے والا دھواں آلودگی میں زیادہ اضافہ نہیں کرتا، اور چونکہ کھیل کافی حد تک اختتام کے قریب پہنچ چکا ہے، تو پھر جب تک ممکن ہے لُطف اندوز کیوں نہ ہوا جائے، بانسری بجانے کا کام جاری رکھا جائے جبکہ زمین جل رہی ہے۔

تبصرہ کرنے کے لئے الفاظ نہیں مل رہے، اور اصل میں اس کو کافی حد تک نظرانداز کر دیا گیا ہے۔

قیادت کا رویہ ری پبلیکن پارٹی میں رائے پر اثرانداز ہوتا ہے، جس کے ارکان روایتی طور پر عالمی حدّت کے مسئلے کو اتنا سنجیدہ ہی نہیں لیتے۔حقیقت تو یہ ہے کہ عام لوگوں میں بھی اسے

اہم معاملات کی فہرست کی حوالے سے بہت نچلا درجہ دیا گیا ہے (اور ایٹمی جنگ کے بڑھتے ہوئے خطرے کو، جو کہ وجود انسانی کو لاحق دوسرا بڑا خطرہ ہے۔رویوں کے حوالے سے کئے گئے جائزوں میں شامل ہی نہیں کیا گیا۔

ہیریسن سیمفر: ووکس (Vox) میں شائع ہونے والے ایک حالیہ مضمون میں، نیچرل ریسورسز ڈیفنس کونسل کی میری انیز ہیینگر نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا ہے: ''یہ عقیدہ کہ انسانی بقا کو لاحق اس قدر عظیم خطرے کو حل کیا جا سکتا تھا اگر ہم میں سے ہر فرد اسراف کی عادتوں میں ہی بہتری یا مطابقت پیدا کر لیتا، نہ صرف خلاف عقل بلکہ خطرناک ہے۔اس کی بدولت ماحولیاتی مسئلہ ایک انفرادی ترجیح بن کر رہ جاتا ہے جسے نیکی یا بدی کے طور پر اُجاگر کیا جاتا ہے، ان لوگوں پر فرد جرم عائد کرتے ہوئے جو ایسی اخلاقی اقدار کو برقرار نہیں رکھتے یا برقرار رکھنے کی صلاحیت سے ہی عاری ہوتے ہیں۔'' ہم آزاد منڈی کی ان نئی ساختوں سے کس طرح نجات حاصل کر سکتے ہیں جن میں صارفین کی آزادانہ ترجیح کو اس نمونے پر فوقیت دی جاتی ہے، جس کے تحت، مثال کے طور پر ان سو کمپنیوں کو ہدف بتایا جاتا ہے جو کہ عالمی سطح پر 71 فی صد اخراج کی ذمہ دار ہیں؟

نوم چومسکی: میرا نہیں خیال کہ ہم منڈی کی طاقتوں پر انحصار کر سکتے ہیں۔وقت کا سارا پیمانہ ہی غلط ہے۔بہت بڑے پیمانے پر فیصلہ کن اقدامات کی ضرورت ہے۔جنہوں نے ماحول کو سب سے زیادہ نقصان پہنچایا ان پر قواعد وضوابط کے ان طریقوں کے ذریعے پابندی لگائی جا سکتی ہے جو اصولی طور پر دستیاب ہیں اور انہیں جمہوری نظام کے تابع رکھنا چاہیے۔محض آلودگی پھیلانے والے بڑے بڑے کرداروں پر پابندی سے کچھ خاص حاصل نہیں ہونے والا۔اس مسئلے سے نمٹنے کے لئے اہم بنیادی تبدیلیوں کی ضرورت ہے جو کہ دراصل بقا کے بحران کا مسئلہ ہے: اس (درکار تبدیلی) کی ایک مثال ٹرانسپورٹ کے مستعد عوامی نظام کی ہے۔کاربن کی مقدار میں کمی کے حوالے سے خاطر خواہ کوششیں بھی ضروری ہیں۔یہاں پر منڈی ہر طرح کے غلط اشارے بھیج رہی ہے، مہلک طور پر اس صورتحال میں، آئی فون کے لئے نئی ایپلیکیشنز کی بدولت سرمایہ کاری زیادہ منافع بخش ہو سکتی ہے، بہ نسبت کاربن کی مقدار میں کمی یا مکمل خاتمے کے لئے طویل المیعاد

www.MashalBooks.org

منصوبوں میں سرمایہ کاری پر، ایک شعبہ جہاں وسائل کی شدید قلت ہے۔ یہاں پر اس انتباہ کو ذہن میں لانا بہتر رہے گا جو جوزف سٹگلز نے ورلڈ بنک ریسرچ پبلیکیشن میں تیس برس قبل جاری کیا تھا، عالمی بینک کا چیف اکانومسٹ (اور نوبل انعام یافتہ) بننے سے پہلے: ہمیں اس ''عقیدے'' سے بچ کر رہنا چاہیے کہ منڈیوں کو سب سے بہتر معلوم ہوتا ہے۔ ذہن پر مُسلّط اس تصور کے لئے ''عقیدہ'' کوئی بُری اصطلاح نہیں ہے کہ آزاد خیالی/ رُکاوٹوں سے پاک نظام کے لئے دور میں منڈیوں کا نظام ہی ہر مسئلے کا حل ہے۔ اور دیگر جنونی مذہبی عقائد کی طرح اس عقیدے کا انجام بھی محض چند ایک تباہیوں کی صورت میں برآمد نہیں ہوا۔

ہیریسن سیمفر: بظاہر یہی لگتا ہے کہ وسیع پیمانے پر، طویل المیعاد منصوبوں پر عملدرآمد کے لئے مختصر مدت کی ایسی اقتصادی، سیاسی، اور نجی قربانیوں کی ضرورت ہوتی ہے جو آج کے دور کے اکثر سیاست دانوں کے لئے کسی قسم کی کشش نہیں رکھتیں۔ اس صورتحال کا رُخ کس طرح پلٹا جا سکتا ہے، یا پھر کیا ہمارے موجودہ سیاسی واقتصادی نظام کی ایک مستقل خصوصیت ہے؟

این سی: یہ ایک مسئلہ ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ فرانس کے پیلی جیکٹ والوں نے مسئلے کو بالکل واضح رُخ دے دیا ہے: حکومت (فرانسیسی) دنیا کے اختتام کی بات کرتی ہے، مگر ہم مہینے کے اختتام تک بھی نہیں پہنچ سکتے۔ توانائی کے قابل تجدید وسائل کی سمت تبدیلی کے نتیجے میں اگرچہ عمومی طور پر بہت زیادہ حیات بخش ماحول پیدا ہو جائے گا مگر اس کی بدولت مزدور طبقے کو بھی کچھ نقصان پہنچنا ناگزیر نظر آتا ہے، جو کہ اس دھچکے کو بمشکل ہی برداشت کر سکتے ہیں۔ اس لئے اس طرح کے اور دیگر مسائل سے نمٹنے کے لئے محتاط منصوبہ بندی کی ضرورت ہے۔ ایسا کیا جا سکتا ہے، اور ٹھوس قسم کے حل تجویز کر دیئے گئے ہیں۔

ہیریسن سیمفر: گرین نیوڈیل (GND) کے لئے سماجی تحریک کا دباؤ امریکہ/ کینیڈا کی سرحد کے دونوں جانب کافی زور پکڑ رہا ہے۔ آپ کے خیال میں اس طرح کا آغاز/ پیش قدمی کیوں ضروری ہے، اور تمام لوگ اس بیانیے کا توڑ کس طرح کر سکتے ہیں کہ جی این ڈی ''مالی اور اقتصادی لحاظ سے تباہ کن ہوگی''؟

نوم چومسکی: اہمیت بدیہی ہونے چاہیے۔ ''بیانیے'' کا توڑ اسے غلط ثابت کر کے کیا جا سکتا ہے، جیسا کہ یہ ہے، اور اس امر کو واضح کر کے بھی کہ اس کا متبادل اتنا تباہ کن ہوگا کہ باقی سب اس کے مقابلے میں ماند پڑ جائے گا۔

ہیریسن سیمفر: میں اب خارجہ پالیسی کی طرف آنا پسند کروں گا۔ معیشت دان مارک ویسبر وٹ اور جیفری ساچس کے مطابق، ٹرمپ انتظامیہ کی جانب سے وینز ویلا پر اگست 2017 سے عائد کردہ پابندیوں کے نتیجے میں ہزاروں لاکھوں افراد موت کے مُنہ میں چلے گئے ہیں اور ملک کے اندر انسانی بحران تیزی سے شدّت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ یقین رہے کہ وینز ویلا پہلے ہی بہت سے مسائل کا شکار ہے، تاہم مغربی طاقتوں، خاص طور پر امریکہ، نے شاویز دور کے ابتدائی ایام سے ہی یہاں پر جمہوریت کی جڑیں کھوکھلی کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے، بشمول 2002 کی ناکام فوجی بغاوت کے۔ اب ''حکومت کی تبدیلی'' کی پالیسی ٹرمپ کے دور میں اور بھی واضح اور خطرناک سمت اختیار کر چکی ہے۔ اس صورتحال کو کس طرح درست کیا جا سکتا ہے، اور وینز ویلا کو ذرائع ابلاغ میں اس قدر متعصّبانہ رنگ چڑھا کر کیوں پیش کیا جاتا ہے؟

نوم چومسکی: امریکہ نے پہلے پہل ہوگو شاویز کو ایک ایسے بڑے بندے کے طور پر برداشت کیا جسے سُدھایا جا سکتا تھا، تاہم صورتحال اس وقت تبدیل ہو کر رہ گئی جب اس نے اوپیک (OPEC) کو اس حوالے سے قائل کر لیا تھا کہ پیداوار میں کمی کر کے قیمتوں کو اتنا مستحکم کر دیا جائے جس کا تیل پیدا کرنے والوں کو فائدہ ہو۔ اس کے تھوڑے ہی عرصے بعد ایک فوجی بغاوت برپا ہوگئی جس کے نتیجے میں شاویز کو ہٹا کر اس کی حکومت کا خاتمہ کر دیا گیا، جس کی امریکہ نے کھلم کھلا حمایت کی اور آزاد خیال ذرائع ابلاغ میں بھی اس اقدام کو سراہا گیا۔ تاہم، اس صورتحال کو جلد ہی پلٹ کر رکھ دیا گیا اور امریکہ کو تخریب و بے دخلی کا راستہ اختیار کرنا پڑا، شاویز کے انتہائی شدید مخالفین پر مُشتمل اقتصادی اشرافیہ کے تعاون سے۔

یہاں ان برسوں میں پیش آنے والے واقعات پر نظر ثانی کرنا مناسب نہیں ہے، تاہم پالیسی میں اس قدر نقائص تھے کہ موجودہ بحران میں ان کے کردار کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا: تیل

پر مبنی اس معیشت کو وسیع تر متبادل وسائل کا حامل بنانا جو اس وقت استوار ہوئی تھی جب امریکہ نے تیل کی دریافت کے بعد ایک صدی قبل اس کا انتظام سنبھالا تھا، اور تیل کی بلند قیمتوں کے زمانے کے لئے ذخائر کو محفوظ کر کے رکھنا۔ شاویز کی موت کے بعد تیل کی قیمتیں نیچے آ گئیں اور مادورو (Maduro) کی حکومت کو قرضے کی مخاصمانہ عالمی منڈیوں سے رجوع کرنا پڑا تھا۔ اس کی حکومت نے بھی بہت ناگوار معاشی فیصلے کئے اور حزب مخالف کی انتہائی شدید اور اکثر اوقات مسلح قسم کی بغاوت کو کچلنے کے لئے جبری اور ظالمانہ ہتھکنڈے استعمال کئے۔

ٹرمپ کی طرف سے عائد کردہ پابندیوں نے ایک شدید قسم کے بحران کو تباہ کن صورتحال میں تبدیل کر کے رکھ دیا ہے، جیسا کہ حزب مخالف کے پائے کے معیشت دان، اور باخبر رہنما فرانسسکو روڈریگیز کے عمومی اثرات کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ روڈریگیز نے، جو کہ اس صورتحال کے لئے بنیادی طور پر مادورو کی پالیسیوں کو موردالزام ٹھہراتا ہے، بتایا ہے کہ امریکہ کی طرف سے عائد مالی پابندیوں کا تعلق تیل کی پیداوار میں بہت زبردست کمی سے ہے، 16.9 ارب ڈالر سالانہ کے حساب سے، اور اس کے ساتھ ہی اس نے ان تباہ کن نتائج سے بھی خبردار کر دیا ہے جو ایک ایسے ملک کو بھگتنے پڑیں گے جو اپنے غذائی ضرورت کا بمشکل 1/3 پیدا کرتا ہے۔ ''ہمیں وینزویلا میں قحط کا سامنا کرنا پڑے گا'' مسٹر روڈریگیز نے خبردار کرتے ہوئے بتایا۔ ''اپریل میں کل درآمدات صرف تیس کروڑ تیس لاکھ ڈالر تھیں اور ان میں سے بھی تقریباً نصف تیل سے متعلق تھیں۔ یہ 2012 کے اعداد و شمار یا درآمدات کی کل مالیت کا صرف 8 فیصد بنتا ہے... حتیٰ کہ اگر ساری درآمدات خوراک کی ہی کیوں نہ تھیں، پھر بھی یہ ملک کی کل غذائی ضرورت کے لئے درکار رقم کا بہت کم تناسب ہے''۔

چیخنا چلانا بہت آسان کام ہے، تاہم مسئلے کے حل کی واحد اُمید جو میرے سامنے تجویز کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ دو مخالف جماعتوں کے درمیان مذاکرات ضروری ہیں تاکہ ایک طرح کی عبوری حکومت قائم کی جا سکے۔

ذرائع ابلاغ عموماً بڑی نرمی کے ساتھ ریاستی پالیسی کی حمایت کرتے ہیں، تاہم شاویز کے

حوالے سے پہلے دن سے ہی مخالفت کا اظہار کیا گیا اور اس وقت سے ہی غیر معمولی طور پر تنقید و تنقیص کا سلسلہ جاری ہے، بعض اوقات حیرت انگیز طریقوں سے۔

ہیریسن سیمفر: برطانیہ میں لیبر پارٹی کے جیریمی کورین کو یہودیت مخالف نظریات کا الزام لگا کر اقتدار سے باہر رکھنے کی کوشش کے خطرناک اثرات برآمد ہوئے، اسرائیل پر تنقید یا صیہونیت مخالف نظریات کو یہودی لوگوں سے نفرت کے مترادف قرار دینے کی صورت میں۔ آپ نے ان ہتھکنڈوں کو شرمناک قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ یہ ہولوکاسٹ کے مظلوموں کی یاد کی توہین ہیں۔ میں اس حوالے سے آپ کا تبصرہ سُننا پسند کروں گا کہ کس طرح غلط قسم کے یہود مخالف الزامات آخرکار یہودیوں کے لئے تکلیف دہ ہیں، اور اس اصطلاح کی اضافی وضاحتیں (جن کے تحت، مثال کے طور پر فلسطینیوں کے حقوق کی حمایت کو یہود مخالف جنون سمجھا جاتا ہے) کیونکر اُلجھن آمیز ہو سکتی ہیں؟)

نوم چومسکی: اس صورتحال کے حوالے سے پائے کا بیان ممتاز اسرائیلی مدبر سیاسی شخصیت ابّا ایبان نے دیا ہے، جس کا، خاص طور پر برطانیہ میں ایک معزز شخصیت کے طور پر (کیمبرج گریجویٹ، نکھرا، سنورا ہوا لہجہ وغیرہ) بہت زیادہ احترام کیا جاتا ہے۔ 1973 میں ایک مقبول آزاد خیال یہودی جریدے (Congress Bi-weekly) میں ایبان نے ایک دلچسپ مضمون لکھا، اُس وقت جبکہ وہ اسرائیلی وزیر خارجہ بھی تھا، جس میں اس نے وضاحت سے بتایا کہ ''غیر یہودی دنیا کے ساتھ کسی بھی مکالمے کا ایک اہم مقصد یہ ثابت کرنا ہوتا ہے کہ یہودیت مخالف اور صیہونیت مخالف نظریئے (Anti Zionism) کے درمیان فرق کسی حساب سے بھی واضح نہیں ہے۔'' صیہونیت مخالف'' محض ''یہودیت مخالف'' کی نئی شکل ہے۔

یوں درپیش فریضے کی اچھی طرح وضاحت ہو جاتی ہے۔ یہاں پر ''صیہونیت مخالف'' کا مطلب ہے اسرائیلی ریاست کی پالیسیوں پر تنقید۔ اس نے اضافی الفاظ کے ساتھ اسی کی اچھی طرح وضاحت کر دی: کوئی غلط فہمی نہ رہے بائیں بازو کی نئی تحریک (New Left) نئی یہودیت مخالف تحریک کی بانی اور فکری پیش رو ہے۔''

www.MashalBooks.org

دا نیو لیفٹ دراصل حد سے بڑھ کر صیہونیت مخالف تھا، البتہ اب اس تسلط اور غیر قانونی آبادکاری کی پالیسیوں کے حوالے سے نرمی ظاہر کرنے لگا ہے، جو کہ ایبان کی قیادت میں ہو رہی تھی۔ ایبان نے دو بڑے مجرموں کی نشاندہی بھی کی ہے: آئی ایف سٹون اور میں، ''جن کی بنیادی اُلجھن کا تعلق یہودیوں کی بقا کے حوالے سے ایک طرح کے احساس جُرم سے ہے'' اور یوں ان کے ساتھ کوئی معقول قسم کا مباحثہ نہیں ہو سکتا۔ ''نیو لیفٹ'' کے حوالے سے اس کے وحشیانہ الزامات، جو پڑھنے کے قابل ہیں، مساوی طور پر مضحکہ خیز ہیں، جن کا اسے یقینی علم تھا، کیونکہ اسے پڑھنا آتا ہے۔

آسمان سے ملنے والا پیغام واضح تھا اور اس وقت سے ہی اس کی فرض شناسی کے ساتھ پیروی ہوتی آ رہی ہے، بعض اوقات اس انداز میں کہ مارکس کا تبصرہ یاد آ جاتا ہے جو اس نے ''المیے کی ایک ڈھونگ کے طور پر تکرار'' کے حوالے سے کیا تھا۔ ایک مثال اینٹی ڈیفمیشن لیگ (Anti Defamation League) کی طرف سے ''رائیل اینٹی سمیٹزم'' پر ایک اہم اشاعت کی ہے، ایسا نظریہ یا تحریک جو 1976 کی فتوحات کے بعد شہری حقوق کی ایک حقیقی تنظیم کی بجائے سٹالن ازم کی نقل بن کر رہ گئی۔ اصل یہودیت مخالف تحریک کا اس پُرانے بیزار کُن ''یہودی مارو'' نعرے سے کوئی تعلق نہیں ہے نہ ہی ہولوکاسٹ کی تردید سے، بلکہ اس کا مقصد دراصل ''جنگ کو بُرے اور امن کو بہت پسندیدہ عمل کے طور پر'' اجاگر کرنا تھا، ویت نام کی جنگ اور سنٹرل امریکہ میں جرائم کے خلاف مظاہرے کر کے، دفاعی بجٹ میں ''کٹوتی'' کر کے، اور عمومی طور پر امریکی طاقت، اسرائیل کا دفاع کرنے والی، میں مداخلت کر کے۔

کوربن اور اس کی پھر سے توانا و جاندار لیبر پارٹی پر حملوں کا تعلق ایک ہی طرح کے ماخذ سے ہے۔ یوں طویل عرصے سے لیبر پارٹی میں متحرک کرس ولیمسن پر بھی ''یہودیت مخالف'' کا الزام عائد کر دیا گیا ہے، ان مطالبات کے ساتھ کہ اسے پارٹی سے باہر نکال دیا جائے۔ اور بنیادی الزام یہ عائد کیا گیا ہے کہ اس نے یہ بیان دیا تھا کہ ''لیبر پارٹی نے ''یہودیت مخالف ابتلاً کے خلاف جدوجہد کے حوالے سے اپنے زبردست ریکارڈ کا دفاع کرتے ہوئے'' کچھ زیادہ ہی

معذرت خواہانہ'' طرز عمل کا مظاہرہ کیا تھا۔ اس سے بھی زیادہ ''حقیقی یہودیت مخالف''

بحر اوقیانوس کے دونوں سمت کاوشیں بڑے دلچسپ انداز میں بھرپور رنگ اختیار کر رہی ہیں، جیسا کہ یہ امر زیادہ سے زیادہ واضح ہوتا جا رہا ہے کہ اسرائیل ''آزاد عوامی رائے'' پر گرفت کرنے میں ناکام ہو رہا ہے اور یوں حمایت کے لئے اس کا انتہائی رجعت پسند عناصر اور اس بنیاد پرست عیسائی تحریک پر انحصار بڑھتا جا رہا ہے جو انتہا پسندانہ اسرائیلی اقدامات کے لئے پرجوش حمایت کے ساتھ ہی بے مثال قسم کے یہودیت مخالف نظریات پر بھی یقین رکھتی ہے (ذرا ان یہودیوں کی قسمت کا تصور کریں جو دنیا کے خاتمے اور حضرت عیسیٰ کی واپسی تک ''حضرت عیسیٰ کو پانے'' میں ناکام رہے)۔

حقیقی یہودیت مخالف عناصر، میرے مفروضے کے مطابق، یہودیوں کو اس انداز میں خود اپنا ہی مضحکہ اُڑاتے دیکھ کر خوش ہو رہے ہیں، جبکہ باقی لوگ اس تصور سے ہی لرزہ براندام ہوں گے۔

اس کا یقیناً مطلب اس امر کی تردید کرنا نہیں ہے کہ آپ لیبر پارٹی میں یہودیت مخالف رجحانات کا برطانیہ کی سطح پر سراغ لگا سکتے ہیں جو، جیسا کہ عمومی جائزوں سے ظاہر ہوتا ہے، تاریخی معیار یا درجوں کے حساب سے بہت کم ہیں اور مسلمانوں سے نفرت اور نسلی تعصب کی دیگر مروجہ شکلوں کے مقابلے میں بہت ہی کم ہیں۔

ہیریسن سیمفر: میرے ذہن میں حال ہی میں ایران اور امریکہ کے درمیان بڑھتے ہوئے تناؤ کے حوالے سے شہ سرخیاں پڑھتے ہوئے ''مصنوعی رضامندی'' (Manufacturing Consent) کی یاد تازہ ہوگئی۔ واشنگٹن پوسٹ میں چھپنے والا یہ مضمون کا میرے خیال میں، بعض ذرائع ابلاغ کی طرف سے ایک ایسی علامتی کوشش ہے جس کی بدولت وہ ٹرمپ کی طرف سے ایٹمی معاہدے کو منسوخ یا ترک کر دینے کے عمل کو کم سے کم نمایاں کر کے اور ایران کی طرف سے یورینیم کی پھر سے افزودگی کے عمل کو مخاصمت میں اضافے کے حوالے سے ایک بڑے محرک کے طور پر پیش کر کے تنازع کو غلط رنگ دینا چاہ رہے ہیں۔ کیا آپ وضاحت کر سکتے ہیں کہ صورتحال

www.MashalBooks.org

کو اس رنگ میں پیش کرنے کا عمل کیونکر خطرناک ہے، اور ناقد قسم کے قارئین کو خبر دینے والے اداروں کی طرف سے بین الاقوامی تعلقات کا مخصوص طریقے سے احاطہ کرنے کے عمل کی کس طرح موثر تشخیص کرنی چاہیے؟

نوم چومسکی: ذرائع ابلاغ تقریباً تقریباً اضطراری یا بے اختیار نہ انداز میں ریاست کے بنیادی عقیدے کی ہی پیروی کرتے ہیں۔ منظر کے اس سرے پر جہاں آزادی اظہار نمایاں ہوتی ہے (نیویارک ٹائمز، واشنگٹن پوسٹ) روایتی طور پر ذرا نرمی یا لچک دکھانا شروع کر دیتے ہیں، آزادی کا تاثر دینے کے لئے۔ ایران، امریکہ تناؤ کے حوالے سے خبریں دینا ایک طویل عرصے سے رائج نمونے کی پیروی لگتا ہے، آسمان تک دستاویزی شکل میں تیار۔ ریاستی تشہیر کے مطابق، ایران مجرم وخطاکار ہے۔ امریکہ نے صرف یہ فیصلہ کرنا ہے کہ آیا ایران کی اشتعال انگیزیوں اور عمومی بغض کا کوئی جواب دینا ہے اور اگر ایسا کرنا ہو تو کس طرح۔ آزاد خیال ذرائع ابلاغ، اپنے انتہائی ناقدانہ انداز میں، اسے مختلف ساخت عطا کرتے ہیں، یعنی دونوں فریقین تناؤ میں اضافہ کر رہے ہیں۔

حقیقت ڈرامائی طور پر مختلف ہے، اور مشکل ہی موضوع بحث۔ ایران نے جے سی پی او اے کی سخت شرائط (عدم پھیلاؤ یا نان پرولیفریشن ٹریٹی پر دستخط کرنے والے کے لئے انتہائی سخت) پر مکمل عمل درآمد کیا ہے۔ امریکہ کے خفیہ ادارے اور دیگر تمام قابل اعتبار ذرائع اس پر اتفاق کرتے ہیں۔ ٹرمپ انتظامیہ نے معاہدے سے ہاتھ کھینچ لیا، اسے اچھی طرح پامال کرتے ہوئے، اور ایسی وحشیانہ پابندیاں عائد کر دیں جن کا مقصد معیشت کو تباہ کرنا اور لوگوں کو سزا دینا تھا۔ ایران کسی قسم کے ردّعمل سے باز رہا، یہ اُمید کرتے ہوئے کہ ہوسکتا ہے یورپی یونین اپنے آقا کے احکامات کی تعمیل سے انکار کر دے، تاہم جب ایسا نہ ہوا تو ایران نے اپنے ایٹمی پروگرام کی بحالی کے حوالے سے چند ایک اقدامات کا آغاز کر دیا، اور یقیناً اسے این پی ٹی کے تحت ایسا کرنے کا حق ہے اور اس وقت بھی جب جے سی پی او اے کو منسوخ کر دیا جائے گا۔ ہوسکتا ہے کہ اس کا نتیجہ خلیج میں چند ایک اشتعال انگیز کاروائیوں کی صورت میں برآمد ہوتا یا نہ ہوتا جیسا کہ ٹرمپ۔ بولٹن۔ پومپیو اتحاد نے الزام لگایا تھا، جو کہ اپنی ساکھ کے حوالے سے اچھی شہرت نہیں رکھتے۔

اور اس ساری صورتحال کو مسترد کر کے رکھ دیا جاتا ہے۔

آزاد صحافت میں جس چیز کا ذکر نہیں کیا جا سکتا وہ بین الاقوامی گیلپ جائزہ ہے جس کے تحت سوال کیا گیا تھا کہ کونسا ملک عالمی امن کے لئے سب سے بڑا خطرہ ہے: امریکہ، اور اس کا دور دور تک کوئی مقابل نہیں تھا۔ ایران کا بمشکل ہی ذکر تھا، امریکی لن ترانیوں کے برعکس کہ ایران امن کے لئے سب سے بڑا خطرہ ہے اور امریکہ، بلاشبہ، دنیا میں امن اور جمہوریت کا سب سے بڑا علمبردار ہے۔

ایران کی طرف سے متصور ایٹمی خطرے کی شدّت میں کمی یا خاتمے کا ایک ہی سیدھا سادا طریقہ ہے: ایک ایٹمی ہتھیاروں سے پاک علاقے یا نیوکلیئر ویپن فری زون (NWFZ) کی مشرق وسطٰی میں بنیاد رکھی جائے، نگرانی و جائزے کے مناسب اقدامات کے ساتھ، جس طرح کہ ایران میں جے سی پی او اے کے تحت کئے گئے ہیں بغیر کسی مداخلت کے، جیسا کہ تسلیم کیا جا چکا ہے۔ یہ تجویز کئی عشرے قبل عرب ریاستوں کی جانب سے پیش کی گئی تھی۔ اس کو ایران کی، جی 77 کے ممالک کی، اور تقریباً ہر دوسرے ملک کی حمایت حاصل تھی، تاہم این پی ٹی پر نظر ثانی کے لئے ہونے والی کانفرنسوں میں اسے امریکہ کی طرف سے باقاعدہ رد (Veto) کیا جاتا رہا ہے، حال ہی میں آخری مرتبہ اوباما کی طرف سے۔ اس کی وجہ بمشکل ہی ڈھکی چھپی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اسرائیل کے ایٹمی ہتھیاروں پر مُشتمل وسیع وعریض ذخیرے کی موجودگی کا اعتراف، جس کے نتیجے میں اسرائیل کو امریکہ کی طرف سے دی جانے والی فوجی امداد غیر قانونی حیثیت اختیار کر جائے گی، اور اس کے جائزے کی اجازت دینا واضح طور پر ناقابل برداشت۔ یوں اس طرح کی پالیسی کی حمایت لازمی طور پر ''حقیقی یہودیت مخالف'' کی ایک اور شکل قرار پائے گی۔

ایک دِلچسپ زیریں حاشیہ (Footnote)، جس پر پابندی لگی ہوئی ہے، یہ ہے کہ امریکہ اور برطانیہ کی یہ منفرد ذمہ داری ہے کہ وہ مشرق وسطٰی میں این ڈبلیو ایف زیڈ کے نفاذ کی کوشش کریں۔ عراق پر حملے کا بہانہ اختراع کرنے کی جستجو میں انہوں نے یو۔ این سیکورٹی کونسل ریزولوشن نمبر 687 کا واسطہ دیا؛ ان کا یہ دعویٰ غلط تھا کہ عراق نے ایٹمی ہتھیار بنا کر اس کی خلاف ورزی کی تھی۔

www.MashalBooks.org

معاہدے کی خلاف ورزی کرنے والے صرف دو ہی فریق تھے: امریکہ اور برطانیہ، جنہوں نے مشرق وسطی میں این ڈبلیو ایف زیڈ کے قیام کے اس کے تقاضے کو غیر اہم بنا کر رکھ دیا۔

ان کانوں کے لئے ان ساری باتوں کا تسلسل سے اعادہ کسی حد تک بیزار کن ہوتا جا رہا ہے جو عقیدوں پر مبنی صداقتوں کے لئے ایک طرح سے جنونی وفاداری کی بدولت بند ہو چکے ہیں۔ ایک ایسی شے جس کی آرویل نے یہ اظہار خیال کرتے ہوئے پیش گوئی کی تھی کہ آزاد برطانیہ میں، ''غیر مقبول تصورات کو طاقت کے استعمال کے بغیر بھی دبایا جا سکتا ہے۔''

ہیریسن سیمفر: اور جگہوں پر، صدر ٹرمپ کی شمالی کوریا کے رہنما کم جونگ ان کے ساتھ حالیہ ملاقات اکیسویں صدی کی سفارت کاری میں ایک اہم موڑ ثابت ہو سکتی ہے۔ جبکہ دوسری طرف اس پروان چڑھتے ہوئے تعلق کو صدر ٹرمپ اور اس کی انتظامیہ کی طرف سے ایشیا میں امریکی جغرافیائی وسیاسی مقاصد کے حوالے سے ایک موثر عنصر کے طور پر بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اس صورتحال کو آپ کس زاویے سے دیکھتے ہیں؟

نوم چومسکی: یہ، میرے خیال میں، غلطی ہوگی کہ ٹرمپ کے مختلف کرتبوں کے پس پردہ کوئی جغرافیائی وسیاسی محرک تلاش کیا جائے۔ وہ اپنے رہنما اصولوں کو باقاعدگی سے واضح کرتا رہتا ہے۔ مثال کے طور پر، 4 جولائی کی دھوم دھامی کے لئے اپنے منصوبوں کا اعلان ''پوٹومک (دریا) پر ریڈ اسکوائر'' (Red Square on the Potomac) کی صورت میں کرتے ہوئے، جیسا کہ فنانشل ٹائمز نے اسے بڑی ترشی سے بیان کیا۔ ٹرمپ نے ٹویٹ میں کہا کہ ان تقریبات کا قائد'' آپ کا پسندیدہ صدر: میں'' ہوں گا۔ یہ واقعی ایک طفلانہ قسم کے عظمت ذات کے ضبط میں مُبتلا شخص کا ایک رہنما اصول ہے جس کے ہاتھ میں دنیا کا مستقبل ہے، نوع انسانی کے حوالے سے ایک حیران کن تبصرہ۔

اس اصول کے عواقب بھی ہیں۔ ایک تو یہ کہ ماضی میں جو کچھ بھی کیا گیا (خاص طور پر نفرت کا ہدف بننے والے اوباما کی طرف سے) مکمل طور پر تباہ کن، امریکہ کے لئے نقصان دہ تھا۔ تاہم اب تاریخ انسانی کا ''عظیم ترین سودے باز'' اس کی تلافی کر دے گا۔ بہت سی صورتوں

میں نتائج تباہ کن ہوتے ہیں، مگر بعض اوقات اس کے افعال کم وبیش معقول ہونے کے ساتھ ہی ہر طرف سے تلخی سے بھرپور مذمت کا نشانہ بن جاتے ہیں۔ کم جونگ ان کے ساتھ معاملات طے کرنا، چاہے محرکات جو بھی ہوں، اس کی ایک مثال ہے۔

اپریل 2018 میں، شمالی وجنوبی کوریا نے ایک تاریخی اعلامیہ جاری کرتے ہوئے باہمی لچک وموافقت کے بعد آخر کار ایٹمی ہتھیاروں سے پاک ماحول کی طرف پیش قدمی کے طریق عمل کا خاکہ واضح کر دیا، جس کا وہ ''اپنے طور پر'' نفاذ کریں گے، بغیر کسی بیرونی مداخلت کے کیونکہ ماضی میں یہ مداخلت انتہائی نقصان دہ ثابت ہوتی رہی ہے۔ جن (بیرونی عناصر) کے لئے یہ مُشکل نہیں ہوتا کہ اصل تاریخی ریکارڈ سے وہ کچھ ثابت کر دیں جو کہ عموماً خبروں اور تبصروں میں توڑ مروڑ کر پیش کیا جاتا ہے، اگرچہ علمی مقام رکھنے والے اس سے بخوبی آگاہ ہوتے ہیں۔

ٹرمپ کافی حد تک ان توقعات پر پورا اترا ہے۔ کم جونگ ان کے ساتھ غیر فوجی علاقے میں اس کی ملاقات اور سرحد کے دونوں طرف علامتی اقدامات امکانی طور پر اس خوفناک اور پر ہول تصادم کے حل کی طرف پہلا قدم ثابت ہو سکتے ہیں، اگر نیک نیتی کا مظاہرہ کیا جائے تو۔ نتیجہ خواہ کچھ بھی نکلے، بڑی بڑی بیرونی طاقتیں، امریکہ سمیت، اسے اپنے اہداف کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کی چالیں چلیں گی۔ دنیا اسی ڈگر پر گامزن رہتی ہے جب تک کہ لوگ اسے قبول کرتے رہتے ہیں۔

ہیریسن سیمفر: چھ برس قبل میں نے آپ سے یہ سوال کیا تھا کہ آپ کے خیال میں دنیا میں امریکہ کا اثر ورسوخ کس حد تک کمزور ہو رہا ہے، اور کیا اس کے نتیجے میں امریکہ کی اس استعدادِ کار میں کمی ہو سکتی ہے جس کی بدولت وہ غیر ملکی قوموں کی، آپ کی 1994 کی تصنیف ''ورلڈ آرڈرز اولڈ اینڈ نیو'' سے مستعار لئے گئے جملے یعنی ''آزاد ترقی کی راہ میں رکاوٹ'' کھڑی کر سکے؟ کیا ہم اب طاقت کے کثیر مراکز کی دنیا میں رہ رہے ہیں؟ کیا ٹرمپ امریکی شہنشاہیت کی اُکھڑتی سانسوں کی علامت ہے، یا یہ مرحلہ ابھی دور ہے؟

نوم چومسکی: ہم نصف صدی تک طاقت کے کثیر مراکز کی دنیا میں رہتے رہے ہیں۔ روسی سلطنت

www.MashalBooks.org

کو ایک طرف رکھتے ہوئے، دنیا میں فوجی طاقت کا شدید غلبہ رہا ہے، تاہم 1970 تک سماجی اور اقتصادی طاقت کے تین اہم مراکز اجاگر ہو چکے تھے؛ جرمنی پر مبنی یورپ، امریکی بنیادوں پر قائم شمالی امریکہ، اور انتہائی متحرک شمال مشرقی ایشیائی خطہ، جو اس وقت جاپان کی بنیادوں پر استوار تھا۔

اس وقت تک ''آزاد ترقی کی راہ میں حائل ہونے کی'' امریکی استطاعت پہلے سے ہی زوال پذیر ہونے لگی تھی۔ مرکزی یا وسطی امریکہ میں ریگن کے مجرمانہ مظالم انسانی اور سماجی آفت تھی، تاہم امریکہ اب اس قابل نہیں رہ گیا تھا کہ ماضی کی طرح فوجی بغاوتیں کروانے اور اپنی مرضی کی دہشتناک حکومتیں مُسلط کروانے کا سلسلہ آرام سے جاری رکھ سکے۔ اور یہ استطاعت اس وقت سے مزید زوال پذیر ہو چکی ہے، اگرچہ اس میں ابھی تک دم خم باقی ہے۔ اور اسی طرح امریکی شہنشاہیت برقرار ہے مگر بدلتی ہوئی شکلوں کے ساتھ۔

فوجی حوالے سے، بلاشبہ، امریکہ دنیا میں بالکل یکہ وتنہا رہ گیا ہے۔ اقتصادی حوالے سے امریکی خام قومی پیداوار یا جی ڈی پی کا عالمی معیشت میں تناسب جنگ عظیم دوئم کے اختتام کے وقت عروج پر پہنچنے کے بعد زوال پذیر ہو چکا ہے۔ تاہم جیسا کہ معیشت کا سیاسی حوالے سے تجزیہ کرنے کے ماہر سین سٹارز نے کہا ہے، عالمگیریت کے نوآزاد (Neoliberal) دور میں قومی حسابی کھاتوں کی پہلے جیسی اہمیت نہیں رہی اس وقت قومی اقتصادی طاقت کا ایک فیصلہ کن پیمانہ کسی بھی ملک کو گڑھ بنانے والی کثیر القومی کمپنیوں کا عالمی دولت میں کل حِصّہ ہے۔ اس پیمانے کی رو سے، جیسا کہ وہ ثابت کرتا ہے امریکہ کی اقتصادی طاقت حیران کُن ہے۔ امریکہ میں کام کرنے والی کثیر القومی کمپنیاں کل عالمی دولت کے نصف حصے پر قابض ہیں، اور تقریباً ہر درجے میں پہلے نمبر پر ہیں۔

علاوہ ازیں، عالمی مالیاتی نظام پر بھی امریکہ کی مضبوط گرفت ہے، جو اسے اس قابل کر دیتی ہے کہ وہ ایسی کمر توڑ اور ہلاکت آمیز پابندیاں عائد کر دے جن کا مقصد ان ریاستوں کے عوام کو سزا دینا ہوتا ہے جو ''جُرات انکار'' جیسے جرم کی مرتکب ہوتی ہیں۔ یہی جرم بنیادی طور پر کیوبا

میں بھی سرزد ہوا تھا، جیسا کہ 1960 کی دہائی کے شروع میں سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کی داخلی دستاویزات سے واضح ہوتا ہے، اور آج ایران کا بھی یہی جُرم ہے۔

شہنشاہیت (Empire) کوئی واضح قسم کا تصور نہیں ہے، تاہم گرفت کرنے اور جبر مُسلط کرنے کے حوالے سے امریکہ عالمی سطح پر سب سے بالا دست طاقت کے زمرے میں آتا ہے۔

عالمی تسلط کا امریکی نظام ٹرمپ کی محفل رقص کی تمام تر کج ادائیوں و مضحکہ خیزیوں کے باوجود برقرار رہ سکتا ہے، مگر شاید تبدیل شدہ حالت میں، رجعت پسند ریاستوں اور ''پابند جمہوریتوں'' کے ایسے نمایاں تر اتحاد کے ساتھ جو اس کے زیر سایہ منظر عام پر آ رہا ہے۔ یہ سوال آیا ایک ایسا ماحول جو ایک منظم انسانی معاشرے کے لئے موافق ہو ٹرمپ اور اس کی ری پبلیکن پارٹی کا بوجھ سہار سکتا ہے، ایک مختلف زمرے میں آتا ہے۔

ماخذ:

https://www.jacobinmag.com/2019/07noam-chomsky-interview-

climate-change-imperialism

www.MashalBooks.org

7- نوم چومسکی اور رابرٹ پولن: اگر ہم مستقبل محفوظ رکھنا چاہتے ہیں تو اس کا حل ''گرین نیوڈیل'' ہے

نوم چومسکی سے انٹرویو، 20 ستمبر، 2019

ہمارے پاس ''گرین نیوڈیل'' کی صورت میں پہلے سے ہی ایک حقیقت پسندانہ حل موجود ہے، کمی ہے تو صرف سیاسی عزم کی۔

موسمیاتی تبدیلی دُنیا کو اب تک پیش آنے والے بحرانوں میں سب سے زیادہ سنجیدہ نوعیت کا حامل ہے۔ اور جیسا کہ ہم جانتے ہیں پوری انسانی تہذیب کا مستقبل داؤ پر لگا ہوا ہے۔ اس کے باوجود عوامی سطح پر آگاہی اور حکومتی اقدامات موسمیاتی تبدیلی کی آفت سے نمٹنے کے لئے انتہائی ناکافی ہیں۔ ذیل میں دیئے گئے انٹرویو میں، نوم چومسکی اور رابرٹ پولن آگے پیش آنے والی آزمائشوں اور ان کے حوالے سے درکار اقدامات پر تبادلہ خیال کرتے ہیں۔

نوم چومسکی ایم آئی ٹی میں لسانیات کے اعزازی (ریٹائرڈ) پروفیسر کے علاوہ یونیورسٹی آف ایریزونا میں بھی لسانیات کے ایک انعام یافتہ پروفیسر کے طور پر خدمات انجام دے رہے ہیں۔ رابرٹ پولن اقتصادیات کے ایک ممتاز یونیورسٹی پروفیسر اور یونیورسٹی آف میساچوسٹس، ایمہرسٹ میں پولیٹیکل اکانومی ریسرچ انسٹیٹیوٹ کے شریک ڈائریکٹر ہیں چومسکی، پولن، اور پولی کرونیو موسمیاتی تبدیلی اور دا گرین نیوڈیل کے موضوع پر ایک کتاب کے شریک مُصنفین بھی ہیں جو 2020 کے موسم بہار میں ورسو (Verso) کے ساتھ آرہی ہے۔

سی۔ جے۔ پولی کرونیو: نوم، میں آغاز آپ سے کرنا چاہوں گا اور آپ سے عرض ہے کہ آپ موسمیاتی تبدیلی کے بحران کی انوکھی صورتحال کے حوالے سے اپنے خیالات کا اظہار کریں۔

نوم چومسکی: خوفناک جنگوں، نا قابل بیان اذیتوں، وسیع پیمانے پر ہلاکتوں اور بنیادی انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کے واقعات سے تاریخ بھری پڑی ہے۔ تاہم کسی بھی قابلِ شناخت یا قابل برداشت شکل میں منظم انسانی زندگی کی تباہی کا خطرہ، یہ ایک بالکل ہی نئی صورتحال ہے۔ ماحولیاتی بحران جو کہ سروں پر منڈلا رہا ہے انسانی تاریخ کا بلاشبہ منفرد بحران ہے، اور حقیقی معنوں میں بقا کا بحران ہے۔ جو لوگ آج زندہ ہیں وہی انسانی قسمت کا فیصلہ کریں گے، اور ان انواع کا بھی جن کو ہم اس رفتار سے تباہ کر رہے ہیں کہ جس کی گذشتہ ساڑھے چھ کروڑ برسوں میں مثال نہیں ملتی، جب (ساڑھے چھ کروڑ برس قبل) ایک بہت بڑا سیارہ زمین سے ٹکرانے کے نتیجے میں ڈائنوسار کے دور کا خاتمہ ہونے کے ساتھ ہی چھوٹے ممالیہ جانوروں کے ارتقائی عمل کی راہ ہموار ہوگئی جو کہ اب زمین پر زندگی کے لئے پھر سے اسی طرح خطرہ ثابت ہو رہے ہیں جس طرح کہ وہ سیارہ، اگرچہ اب فرق صرف یہ ہے کہ ہمارے سامنے عمل/ انتخاب کا راستہ موجود ہے۔

اس دوران دنیا محو تماشا ہے جبکہ ہم ایک نا قابل تصور درجے کی تباہی کی سمت گامزن ہیں۔ ہم خطرناک حد تک اس عالمی درجہ حرارت کے قریب پہنچ رہے ہیں جو آج سے 120000 برس قبل تھا، جب سطح سمندر آج کے دور کی نسبت 6 تا 9 فٹ بلند ہو چکی تھی۔ برفانی تودے/ قطعات 1990 کے عشرے کی نسبت بہت تیزی سے سمندر میں پھسل رہے ہیں، جیسا کہ بعض علاقوں میں برف کی سو میٹر سے زیادہ موٹی تہہ گرم ہوتے ہوئے سمندروں کی بدولت معدوم ہو کر رہ گئی ہے، یوں موجود نقصانات کو ہر برس دوگنا کرتے ہوئے۔ برفانی تہوں کا مکمل زیاں سمندر کی سطحوں کو پانچ میٹر تک بلند کر دے گا، جس کے نتیجے میں ساحلی علاقے ڈوب جائیں گے اور باقی جگہوں پر بھی انتہائی تباہ کن اثرات مرتب ہوں گے، جیسے مثال کے طور پر بنگلہ دیش کے زیریں میدانی علاقے۔ یہ ان لوگوں کی بے شمار تفکرات میں سے صرف ایک ہے جو اس صورتحال کی طرف توجہ کئے ہوئے ہیں جو کہ ان کی آنکھوں کے سامنے رونما ہو رہی ہے۔

www.MashalBooks.org

موسمیاتی تبدیلی کے اثرات پر تحقیق کرنے والے سائنسدان یقیناً بغور جائزہ لے رہے ہیں اور سختی سے خبردار کر رہے ہیں۔ اسرائیل کے ماہر موسمیات باروچ رِنکیو پیچ نے عمومی کیفیت کی بڑی واضح خاکہ کشی کی ہے:

ہمارے بعد، طوفان عظیم ہوگا، جیسا کہ کہاوت ہے۔ لوگوں کو مکمل ادراک نہیں ہے کہ ہم کیا کہہ رہے ہیں... اُنہیں فہم نہیں ہے کہ ہر شے میں تبدیلی کا امکان ہے: اس ہوا میں جس میں ہم سانس لیتے ہیں، وہ خوراک جو ہم کھاتے ہیں، وہ پانی جو ہم پیتے ہیں، زمین کے وہ مناظر جو ہم دیکھتے ہیں، سمندر، موسم، روزمرہ کا معمول، معیار زندگی۔ ہمارے بچوں کو یا تو مطابقت اختیار کرنی ہوگی یا وہ معدوم ہو کر رہ جائیں گے... مگر یہ میرا مسئلہ نہیں ہے۔ میں خوش ہوں کہ میں اس وقت موجود نہیں ہوں گا۔

ہاں تو عین اس وقت جب سب لوگوں کو مل کر عمل کرنا ہوگا، پوری وابستگی کے ساتھ، ''انسانیت کو درپیش حتمی آزمائش'' سے نمٹنے کے لئے۔ تاہم، انسانی تاریخ کی طاقتور ترین ریاستوں کے سربراہان، اپنے اعمال کے پورے شعور کے ساتھ، پورے جوش وخروش کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک منظم انسانی زندگی کے امکانات تباہ کرنے پر تُلے ہوئے ہیں۔

چند ایک مستثنیات کے ساتھ، امریکہ میں رائج الوقت سیاسی قوتیں مسلسل دوسری طرف رُخ کئے رکھتی ہیں جب معاملہ موسمیاتی تبدیلی کا ہو۔ ایسا کیوں ہے؟

چومسکی: نوآزاد معیشت کے دور میں دونوں سیاسی جماعتیں دائیں سمت کو لڑھک کر رہ گئی تھیں، جیسا کہ کافی حد تک یورپ میں ہوا۔ ڈیموکریٹک نظریات کی نمائندگی کرنے والے سیاسی حلقے اب کم وبیش وہ کچھ نظر آنے لگے ہیں کہ جنہیں کہ چند برس قبل ''اعتدال پسند ری پبلیکنز'' کہا گیا تھا۔ ری پبلیکنز اپنی جگہ پر نہیں رہے کہ حقیقت سے دور ہو چکے ہیں، موازنہ کرنے والے جائزوں کے مطابق وہ اپنے عمومی موقف کے حوالے سے یورپ کی دائیں بازو کی کم معروف سیاسی جماعتوں کی صف میں کھڑے نظر آتے ہیں۔ علاوہ ازیں وہ اس واحد اہم رجعت پسند جماعت کی تشکیل کرتے ہیں جو انسانی سرگرمیوں کی بدولت پیدا ہونے والی موسمیاتی تبدیلی سے انکاری

ہے، جیسا کہ پہلے ہی ذکر کیا جا چکا ہے: ایک عالمگیر بے قاعدگی۔ امریکن انٹرپرائز انسٹیٹیوٹ کے دو معزز سیاسی تجزیہ نگاروں تھامس مین اور نارمن اورنسٹین نے ری پبلیکن پارٹی کو 90 کی دہائی میں نیوٹ گنگرچ کے قبضے کے وقت سے ہی ایک ایسی جماعت کے طور پر بیان کیا ہے جو کہ معمول کی سیاسی جماعت کی بجائے ایک ایسی ''روایت شکن بغاوت'' لگتی ہے جس نے کافی حد تک پارلیمانی سیاست سے کنارہ کشی کر لی ہو۔ میک کونیل کی قیادت میں یہ امر اور بھی واضح ہو کر رہ گیا ہے، تاہم اسے ری پبلیکن پارٹی کے حلقوں میں بہت زیادہ رفاقت میسر ہوگئی ہے۔

موسمیاتی تبدیلی پر قیادت کا موقف یقیناً ری پبلیکن پارٹی کے وفاداروں پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔ صرف 25 فی صد کے قریب ری پبلیکن نمائندے (اکیسویں صدی کے زیادہ ہوشیار طبقے کا 36 فی صد) اس امر کو تسلیم کرتے ہیں کہ عالمی حدّت کی ذمہ داری انسانوں پر عائد ہوتی ہے۔ چونکا دینے والے اعداد وشمار۔

اور ری پبلیکن لوگوں کے نزدیک ہنگامی مسائل کی فہرست میں عالمی حدّت (اگر اس کا کوئی وجود ہے تو) کا سُراغ تقریباً کہیں بھی نہیں ملتا۔

اس امر پر اصرار کرنا غضبناک تصور کیا جاتا ہے کہ ری پبلیکن پارٹی انسانی تاریخ کی خطرناک ترین تنظیم ہے۔ شاید ایسا ہی ہو، تاہم سنجیدہ خدشات کے پیش نظر اور کیا معقول نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے؟

باب، ''دا گرین نیو ڈیل'' کو شاید وہ واحد قابل عمل حل تصور کیا جاتا ہے جس کی بدولت موسمیاتی تبدیلی کی اس نوعیت کی تباہی سے بچا جا سکتا ہے جیسی کہ نوم نے اوپر بیان کی ہے، اس کے باوجود بہت سے لوگ اسے ابھی تک غیر حقیقی سمجھتے ہیں، نہ صرف خالص اقتصادی تناظر میں (دعویٰ یہ کیا جاتا ہے کہ یہ استطاعت سے ہی باہر ہے)، بلکہ اس مفہوم میں بھی کہ جدید معیشتیں اور معاشرے زیر زمین ایندھن کے بغیر فعال ہی نہیں ہو سکتے۔ پہلا سوال تو یہ ہے کہ کیا ''گرین نیو ڈیل'' حکمت عملی پر مبنی ایک ایسی تفصیلی تجویز ہے جو ہمیں موسمیاتی تبدیلی کی تباہ کاری سے بچا سکتی ہے، اور دوسرا یہ کہ آیا یہ مبنی بر حقیقت ہے؟

رابرٹ پولن: دا گرین نیوڈیل کو گذشتہ چند برسوں کے دوران ایک منظم ساخت کے طور پر کافی مضبوط بنیاد ملی ہے۔ یہ واحد پیشرفت بھی بہت بڑی کامیابی ہے۔ تاہم یہ امر بھی واضح ہے کہ ہمیں اس عظیم تصور کو ایک قابل عمل پروگرام میں تبدیل کرنا ہے۔ میرے خیال میں گرین نیوڈیل کے خاکے میں رنگ بھرنے کا کام ایک واحد سادہ قسم کی تجویز پر عملدرآمد سے شروع ہوتا ہے: ہمیں زیادہ سے زیادہ تیس برسوں کے اندر اندر توانائی کے ایک وسیلے کے طور پر تیل، کوئلے اور قدرتی گیس کا استعمال روکنا ہوگا؛ اور یہ سب اس طرح سے کرنا ہے کہ اس عمل کی بدولت معیار زندگی میں اضافے اور پوری دنیا کے محنت کشوں اور غریب افراد کو کام کے وسیع تر مواقع کی فراہمی کا سلسلہ بھی جاری رہے۔

گرین نیوڈیل کا یہ نمونہ، اپنی خالص اقتصادی اور تکنیکی خصوصیات کے ساتھ، دراصل مکمل طور پر حقیقت پسندانہ ہے۔ آلودگی سے پاک توانائی کے قابل تجدید وسائل، بشمول شمسی، ہوا کی طاقت پر مبنی، زمینی حرارت پر مبنی اور ذرا محدود پیمانے پر آبی اور کم اخراج کی حامل حیاتیاتی توانائی (Bioenergy)، لاگت کے حساب سے یا تو پہلے ہی زیر زمین ایندھن اور ایٹمی توانائی کے برابر ہیں یا پھر زیادہ سستے ہیں۔ علاوہ ازیں آلودگی کے اخراج میں کمی کا واحد آسان ترین اور سستا طریقہ توانائی کے باکفایت ہونے کے معیار میں اضافہ کرنا ہے، جس کے لئے موجودہ عمارات میں مناسب تبدیلیاں کرنا؛ نئی عمارات کو اس طرح فعال بنانا کہ توانائی کے استعمال کی قطعاً ضرورت نہ رہے؛ اور دھواں اگلتی ہوئی کاروں کی جگہ ٹرانسپورٹ کا وسیع تر عوامی نظام اور برقی کاریں متعارف کرانا جیسے اقدامات کرنے ہوں گے۔ توانائی کی کفایت کے اقدامات، تعریف کی رو سے، لوگوں کا پیسہ بچائیں گے، مثال کے طور پر آپ کا گھریلو بجلی کا بل آدھا ہوسکتا ہے گھر کے اندر روشنی، حرارت یا ٹھنڈک کے لئے توانائی کا استعمال کم کئے بغیر۔ چنانچہ گرین نیوڈیل کی صارفین کو طویل مدت میں کوئی قیمت ادا نہیں کرنی پڑے گی، اس وقت تک جب تک ہم گرین نیو ڈیل کے لئے سرمایہ کاری کا دراصل انتہائی سادہ مسئلہ مصارف میں کمی سے ہونے والی اس بچت سے حل کرتے رہیں گے جو ہمیں توانائی کی کفایت کے معیار میں اضافے اور سستی قابل تجدید

توانائی پیدا کر کے حاصل ہوگی۔ میرے رفقائے کار نے اور میں نے مل کر تخمینہ لگایا ہے کہ آلودگی سے پاک توانائی کا سو فیصد نظام تعمیر کرنے کے لئے تقریباً اگلے تیس برس تک عالمی خام پیداوار کا سالانہ 2.5 فی صد درکار ہوگا۔ جی ہاں ڈالر کے حساب سے یہ بہت زیادہ رقم بنتی ہے، 2021 میں تقریباً 2 کھرب (Trillion) ڈالر، جس میں بعد ازاں اضافہ ہوتا رہے۔ تاہم اس کا یہ بھی مطلب ہے کہ عالمی اقتصادی سرگرمی کا 97.5 فیصد ابھی بھی ایسے شعبوں کے لئے وقف کیا جا سکے گا جو آلودگی سے پاک توانائی کے زمرے میں نہیں آئیں گے۔

لہٰذا، گرین نیوڈیل، ہر لحاظ سے، ایک ایسا حقیقت پسندانہ منصوبہ ہے جو عالمی موسمیاتی یا ماحولیاتی استحکام کے لئے اپنایا جا سکتا ہے۔ زیادہ مخصوص طور پر، گرین انرجی ڈیل کے تحت ماحول کے استحکام کے حوالے سے آلودگی میں ضروری کمی کے لئے مطلوبہ اہداف حاصل کئے جا سکتے ہیں جس کے لئے 2100 تک 1.5 ڈگری سیلسیئس (Celsius) کا قبل از صنعتی دور کے درجوں سے اوپر، درجہ حرارت برقرار رکھنا ہوگا، جیسا کہ انٹر گورنمنٹ پینل آن کلائمنٹ چینج (IPCC) نے دیا، یہ نہیں ہے کہ آیا گرین نیوڈیل اقتصادی یا تکنیکی لحاظ سے قابل عمل ہے یا نہیں، بلکہ یہ کہ آیا یہ سیاسی لحاظ سے قابل عمل ہے۔ اس سوال کے جواب میں نوم بلاشبہ یہ پوچھ سکتا ہے: کیا ہم، نوع انسانی، خود کو عین اکیسویں صدی کے سیارے جیسا بننے کی اجازت دے دیں گے؟

اس دعوے کے بارے میں کیا خیال ہے کہ سو فیصد قابل تجدید توانائی کے حصول کا نتیجہ اچھی تنخواہ والی کروڑوں ملازمتوں کے زیاں کی صورت میں برآمد ہوگا؟

پولن: دراصل، آلودگی سے پاک توانائی پر سرمایہ کاری نئی ملازموں کی تخلیق کا ایک اہم وسیلہ ہوگی، دنیا کے تمام خطوں میں۔ فیصلہ کن عنصر یہ ہے کہ آلودگی سے پاک توانائی کے شعبے میں سرمایہ کاری توانائی کے رواں آلودہ وسائل کے شعبے کی نسبت ملازمتوں کے بہت زیادہ مواقع فراہم کرے گی، ان تمام ممالک میں خرچ کردہ رقم کے ہر ڈالر پر دو تا چار گنا زیادہ ملازمتیں جن کا ہم جائزہ لے چکے ہیں، بشمول برازیل، چین، انڈیا، انڈونیشیا، جنوبی افریقہ، اسپین، اور امریکہ کے۔ یقیناً وہ ملازمتیں جو کہ زیر زمین ایندھن کی صنعت سے وابستہ ہیں بالکل ختم ہو کر رہ جائیں گی۔ متاثرہ

www.MashalBooks.org

کارکنوں اوران سے وابستہ خاندانوں کوتبدیل ہوتی ہوئی صورتحال کے حوالے سے اُٹھائے گئے منصفانہ اقدامات کی وساطت سے فراخدلانہ امدادفراہم کرنی چاہیے،جن میں کارکنوں کی پنشن کی ضمانت ،لوگوں کوآمدنی کے کسی نقصان کے بغیرنئی ملازمتیں فراہم کرنا،اورمتاثر طبقات پرمختلف منصوبوں کے ذریعے سرمایہ کاری کرناشامل ہیں۔زمین کی بحالی کا کام بھی سرمایہ کاری کاایک ایسا موقع فراہم کرتاہے،جس میں کوئلے کی ترک کردہ کانوں کی صفائی اورکوئلے کی بچ جانے والی راکھ سے مفید مصنوعات کی تیاری،جیسے مثال کے طور پرکاغذوغیرہ۔میں اس امر پر جتنااصرارکروں کم ہے کہ پوری دنیا میں،''منصفانہ تبدیلی کے عمل'' پرمبنی پروگرام کوگرین نیوڈیل میں مطلق طور پر مرکزی حیثیت کا حامل سمجھنا چاہیے۔

نوم،ہم موسمیاتی تبدیلی کےعمل کوروکنے کے لئےحکومتی اقدامات کی ضرورت کےحوالےسےعوام کی آگہی میں کس طرح اضافہ کریں؟

چومسکی : اس کا جواب سادہ ساہے: سخت محنت کریں اس کے لئے کوئی نئی مخصوص تدبیریں نہیں ہیں۔ہم سب کومعلوم ہے کہ پیغام کیا ہے۔ہمیں ان رُکاوٹوں کا بھی علم ہے جو دورکرنی ہیں۔ہمیں پیغام کوواضح شکل دینے کے طریقے اختیارکرنے ہوں گے،الفاظ اورعمل دونوں کی وساطت سے،تاکہ روکاوٹوں پرقابو پایا جاسکے۔

پیغام کے دو پہلو ہیں: ایک تو یہ کہ ہمیں وجود یابقا کے ایک ایسے بحران کا سامنا ہےجس کا جلد سے جلدتدارک کرنا چاہیے؛ دوسرا یہ کہ،اس پرقابو پانے کے طریقے موجودہیں۔

پہلا جزوانتہائی موثراورمعتبرقسم کے جرائد میں چھپنے والے حالیہ مضامین میں بہت سادگی سے واضح کردیا گیاہے۔آکسفورڈ میں طبیعیات کے پروفیسر ریمنڈ پیئرہیومبرٹ نے،جوکہ آئی پی سی سی کی حالیہ رپورٹ کاایک اہم مُصنف بھی ہے،موجودہ حالات اورترجیحات کے حوالے سے اپنے ایک جائزے کا آغاز ان الفاظ سے کیا ہے:''ہمیں اب اپنی توجہ سیدھی ادھرمرکوز کرنی چاہیے،آئیں بائیں شائیں کئے بغیر۔جہاں تک موسمیاتی بحران کاتعلق ہے،ہاں تواب گھبرانے کا وقت آگیا ہے...ہم بہت شدید مُشکل میں ہیں۔'' وہ،بعدازاں بڑی احتیاط اور باریک بینی

سے تفصیلات پیش کرتاہے،ممکنہ تکنیکی حل اوران کے ساتھ مُنسلک بہت سنجیدہ قسم کے مسائل پر نظرثانی کرتے ہوئے،اس نتیجے کے ساتھ:''کوئی متبادل راستہ نہیں ہے۔''' ہمیں اب کاربن گیسوں کے اخراج سے مکمل نجات کی طرف جانا ہوگا،اورتیزی سے۔

دوسرے جزوکی وضاحت قائل کرلینے والی تفصیلات کے ساتھ باب کی تحقیق میں کی گئی ہے،جس کامختصرجائزہ یہاں لیا گیاہے۔

پیغام لازماًایسے طریقوں سے آگے پہنچانا چاہیے کہ ان لوگوں میں مایوسی اورشکست خوردگی کا احساس جنم نہ لے جواسے تسلیم کرنے پرتیار ہوں،نہ ہی ان لوگوں کے اندرخفگی،غُصہ اورحتیٰ کہ اسے بڑے پیمانے پرمسترد کردینے کی خواہش پیدا کرے جواس شے کوقبول نہ کریں جوکہ دراصل غالب انداز میں واضح ہورہی ہے۔

موخرالذکرصورتحال میں یہ سمجھنا ضروری ہے کہ اس کے اسباب کیا ہیں،شاید سائنس کو بالکل ہی مسترد کردینے کے،یا پھرمعیشت دانوں کی طرف سے منڈی کے نظام پرمبنی حل کوترجیح دینے کے جو،چاہے کوئی ان کے بارے میں جومرضی سوچ رکھتا ہو،وقت کے بالکل ہی غلط پیمانے پرہیں،یا پھران لوگوں کی کثیرتعداد جو''حضرت عیسیٰ کی واپسی'' کی توقع رکھتی ہے،یا پھروہ لوگ جو یہ خیال کرتے ہیں کہ ہمیں کوئی نامعلوم ٹیکنالوجی یا کوئی عظیم شخصیت بچالے گی،شاید سٹینفورڈ یونیورسٹی کے ہُوورانسٹیٹیوشن کی علمی شخصیات کے تصورکی پیداوارکوئی ایسی عظیم الجثہ شخصیت جس کی ''روح ملک کے اندر ڈگ بھرتی پھرتی ہے،ہمیں کسی مہربان اور دوست دار بھوت (رونالڈریگن) کی طرح گھورتی ہوئی۔''

کام آسان نہیں ہوگا۔اسے فوری طور پرسرانجام دینا ہوگا۔الفاظ کے ساتھ بھی اوراعمال کے ساتھ بھی،جس طرح کہ ستمبر 2019 کی موسمیاتی ہڑتالوں میں سرانجام دیے گئے تھے۔

باب،گرین نیوڈیل کےتصورکااحاطہ کرنےاوراسےاپنانے کے لئےمزدورتحریک کوکیاکرناپڑے

گا؟

پولن: گرین نیوڈیل کوکئی برسوں سے مزدورتحریک میں زبردست حمایت حاصل ہورہی ہے۔ابھی منزل بہت دور ہے، تاہم پیشرفت واضح نظرآرہی ہے۔مثال کےطور پرواشنگٹن کی ریاست میں اُس اتحادکی قیادت،جس نے کہ 2018 کے انتخابی مرحلے کے دوران گرین نیوڈیل کی تجویز آگے بڑھائی تھی، مستقبل پرنگاہ رکھنے والے ریاست کے اس وقت کے صدراے ایف ایل سی آئی او، جیف جانسن نے کی تھی۔آخرمیں اس ساری مُہم جوئی کواس وقت شکست کا سامنا کرنا پڑا جب تیل کی کمپنیوں نے ذرائع ابلاغ یانشریاتی اداروں پر3 کروڑڈالرکی مسموم تشہیری مہم کے ساتھ یلغارکر دی،نومبرمیں ہونے والے انتخابات سے ہفتوں پہلے۔اب اس طرح کی مُہم جوئیوں کا آغاز کولو ریڈومیں بھی کیاجارہاہے،ایک بار پھرریاست کے بڑے مزدوررہنماؤں کی قیادت میں۔

یقیناً،ضرورت اس امرکی ہے کہ ان چندایک روشن مثالوں سے آگے بڑھاجائے۔یہاں پر جو کچھ فیصلہ کن ہے وہ یہ ہے کہ موسمیاتی تبدیلی کے حوالے سےتحریک کو''تبدیلی کے منصفانہ عمل'' کے ساتھ گرین نیوڈیل کے ایک ایسے جزوکےطور پرمکمل طوروابستگی کا مظاہرہ کرنا چاہیے جو کہ دوسرے اجزا کے ساتھ مساوی اہمیت رکھتاہے۔موسمیاتی تبدیلی کی تحریک کواس نکتے پربھی واضح ہونا چاہیے آلودگی سے پاک معیشت کی تعمیر ملازمتوں کے بڑھتے ہوئے مواقع اور بلند ہوتے ہوئے معیارات زندگی کے حوالے سے معاون ثابت ہوگی،جیسا کہ مجھےیقین ہے کہ یہ ایسا کرسکتی ہے۔

اس کا کوئی جوازنہیں ہے کہ گرین نیوڈیل کا کسی بھی طریقے سے کفایت شعارانہ اقتصادی پالیسیوں کے ساتھ تعلق جوڑ دیاجائے۔اس کے برعکس آلودگی سے پاک توانائی میں سرمایہ کاری کی بدولت چھوٹے پیمانے کی عوامی،امداد باہمی کی،اورنجی ملکیت کی مختلف النوع شکلوں کے لئے نئے مواقع پیداہوں گے۔آلودگی سے پاک توانائی کی فراہمی کے لئے آپ کوکان کنی کے بڑے بڑے منصوبوں، پائپ لائنوں یا کھدائی کے ذریعے دریافت کرنے کی سرگرمیوں کی ضرورت نہیں رہتی۔چھتوں کے اوپراور گاڑیاں کھڑی کرنے والی جگہوں پر شمسی توانائی جذب کرنے

والے تختوں کی تنصیب اور کھیتوں میں ہوا سے چلنے والی چرخیاں لگانے سے بھی ایک پروان چڑھتی ہوئی اور ہمہ گیرمساوات کے اصولوں پرمبنی معیشت کے تقاضے پورے کرنے کے ہدف کی سمت معقول پیشرفت ہوسکتی ہے۔اس تناظر میں، گرین نیوڈیل کودرست معنوں میں ایک سادگی کی مظہر معیشت کے مکمل قابل عمل متبادل کی پیش کش کےطور پراورایک ایسے واحد حقیقت پسندانہ راستے کے طور پر دیکھنا چاہیے جس پرچل کرہم اکیسویں صدی کے سیارے کی ہوبہونقل بننے سے بچ سکتے ہیں۔

ماخذ:

http://truthout.org/articles/org/articles/noam-chomsky-and-robert-pollin-if-we-want-a-future-green-new-deal-is-key

www.MashalBooks.org

8- یوم حشر کی گھڑی، ایٹمی ہتھیار، موسمیاتی تبدیلی اور بقا کے امکانات

نوم چومسکی کی تصنیف ''ہو رولز دا ورلڈ؟'' نیو یارک میٹرو پولیٹن بکس، 2016 سے اقتباسات

جنوری 2015 میں ایٹمی سائنسدانوں کے خبر نامے (Bulletin) کے تحت یوم حشر کی مشہور زمانہ گھڑی پر وقت آدھی رات میں تین منٹ کر دیا گیا، خطرے کی ایسی سطح جو تیس برسوں میں پہلی مرتبہ اتنی اونچی ہوئی تھی۔ اس تباہ کن صورتحال کی سمت پیشرفت کی وضاحت کرتے ہوئے خبر نامے میں جاری کردہ بیان کے تحت بقا کے حوالے سے دو اہم خطرات کی دہائی دی گئی: ایٹمی ہتھیار اور ''بے لگام موسمیاتی تبدیلی۔'' اس بیان یا پکار میں ان عالمی رہنماؤں کی مُذمت کی گئی جو ''اس رفتار سے یا سطح پر اقدامات کرنے میں ناکام ہو گئے تھے جو شہریوں کو ممکنہ تباہی سے محفوظ رکھنے کے لئے ضروری تھے۔'' اور یوں ''اپنے اہم ترین فریضے، یعنی انسانی تہذیب کی صحت اور طاقت کی یقین دہانی و تحفظ، کی انجام دہی میں ناکامی کی بدولت روئے زمین پر ہر فرد کی زندگی'' خطرے میں ڈال رہے تھے۔

اس وقت سے اس امر کا مناسب جواز پیدا ہو گیا کہ گھڑی کی سوئیوں کو یوم حشر کے وقت کے اور بھی قریب کر دیا جائے۔

2015 کے اختتام کے ساتھ ہی عالمی رہنما پیرس میں اکٹھے ہوئے تا کہ ''بے لگام موسمیاتی تبدیلی'' کے شدت اختیار کر جانے والے مسئلے کا حل نکالا جائے۔ شاید ہی کوئی دن

ایسا گزرتا ہو۔ جب اس بحران کی شدت کا کوئی نیا ثبوت سامنے نہ آتا ہو۔ ایک ایسا اتفاقی ثبوت، پیرس کانفرنس کے آغاز سے ذرا پہلے، ناسا کی جیٹ کو فضا میں روانہ کرنے والی تجربہ گاہ کی طرف سے جاری کردہ اس تحقیق یا جائزے کی صورت میں سامنے آیا جس نے منطقہ شمالی (Arctic) پر موجود برف کا مشاہدہ کرنے والے سائنسدانوں کو حیران کر دینے کے ساتھ ہی خبردار بھی کر دیا۔ اس تحقیق کے مطابق گرین لینڈ کا ایک بہت بڑا برفانی قطعہ، زکاریائی اسٹروم (Zachariae Isstrom)، ''برف زار کی مستحکم حالت سے 2012 میں الگ ہو کر تیز رفتار پسپائی کے مرحلے میں داخل ہو گیا'' جو ایک غیر متوقع اور ہولناک پیشرفت تھی۔ اس برفانی قطعے یا تودے میں ''اتنا پانی ہے کہ جس کی بدولت سمندر کی عالمی سطح میں 18 انچ (46 سینٹی میٹر) سے زیادہ اضافہ ہو سکتا ہے، اگر یہ مکمل طور پر پگھل گیا تو۔ اور اب اس کے وزن میں تیزی سے کمی واقع ہو رہی ہے، ہر برس 5 ارب ٹن کے حساب سے۔ یہ ساری کی ساری برف ٹوٹ کر شمالی بحر اوقیانوس میں گر رہی ہے۔''

اس کے باوجود اس امر کی بہت کم توقع تھی کہ پیرس میں اکٹھے ہونے والے عالمی رہنما ''تیزی سے اقدامات کریں گے یا پھر اس پیمانے پر جو کہ شہریوں کو ممکنہ تباہی سے بچانے کے لئے ضروری ہے۔'' اور اگر کسی معجزے کی بدولت وہ ایسا کرتے بھی تو اس کا کوئی فائدہ نہیں ہونا تھا، ان وجوہات کی بدولت جو انتہائی پریشان کن ہیں۔

جب معاہدے کی پیرس میں منظوری دے دی گئی تو فرانس کے وزیر خارجہ لارنٹ فیبیئس نے، جسے کہ ان مذاکرات کی میزبانی کا شرف ملا تھا، اعلان کیا کہ ''یہ قانونی طور پر پابندی کا متقاضی ہے۔'' یہ اُمید کی کرن ہو سکتی ہے، تاہم بہت سی رُکاوٹیں ایسی ہیں جو قریبی توجہ کی مستحق ہیں۔

ذرائع ابلاغ میں پیرس کانفرس کے وسیع پیمانے پر تذکرے میں سب سے اہم جُملے شاید یہی تھے جو کہ نیو یارک ٹائمز کے طویل تجزیے کے آخر میں مدفون تھے: ''روایتی طور پر، مذاکرات کرنے والوں نے قانونی پابندی کا متقاضی ایک ایسا معاہدہ اختراع کرنے کی کوشش کی ہے جس کے موثر ہونے کے لئے شریک ممالک کی حکومتوں کی تصدیق ضروری ہے۔ اس معاملے

میں ،تاہم، امریکہ کی وجہ سے ایسا (حکومتوں کی تصدیق) ہونے کا کوئی امکان نظر نہیں آتا۔ یہ معاہدہ کیپیٹل ہل پہنچتے ہی غیر موثر ہو جائے گا کیونکہ ری پبلیکن کی اکثریت پر مبنی سینیٹ میں دو تہائی ووٹ لینا ممکن نہیں لگتا۔ لہٰذا اب لازمی منصوبوں (معاہدوں)، اوپر سے نیچے کی طرف اہداف کی جگہ رضا کارانہ منصوبے لے رہے ہیں۔'' اور رضا کارانہ منصوبے ناکامی کی ضمانت ہیں۔

''امریکہ کی وجہ سے۔'' زیادہ واضح طور پر ری پبلیکن پارٹی کی بدولت، جو کہ ایک معیاری انسانی بقا کے لئے اب حقیقی خطرہ بنتی جا رہی ہے۔

نتائج کو پیرس معاہدے پر ٹائمز کے ایک اور مضمون میں اجاگر کر کے دکھایا گیا ہے۔ طویل تحریر کے آخر میں کامیابیوں کو سراہتے ہوئے، مضمون نگار نے یہ نکتہ عیاں کیا ہے کہ کانفرنس میں تخلیق کردہ نظام'' کا وسیع پیمانے پر دارومدار مستقبل کے ان رہنماؤں پر ہے جو کہ ان پالیسیوں کو آگے بڑھائیں گے۔ امریکہ میں ری پبلیکن پارٹی کے ہر اس اُمیدوار نے جو کہ 2016 کے صدارتی انتخاب میں حصہ لینے کا خواہش مند ہے، نہ صرف موسمیاتی تبدیلی کی سائنس کے حوالے سے شکوک یا انکار کا اظہار کیا ہے بلکہ مسٹر اوباما کی موسمیاتی (تبدیلی کی) پالیسیوں کی بھی مخالفت کی ہے۔ سینیٹ کے اندر مچل میک کونیل نے، وہ ری پبلیکن رہنما جس نے مسٹر اوباما کے موسمیاتی تبدیلی کے لائحہ عمل کے حوالے سے لگائے گئے الزامات کی مہم میں قائدانہ کردار ادا کیا ہے، کہا کہ ''اس سے قبل کہ اس کے بین الاقوامی شریک کار شیمپین کی بوتل کھولیں، انہیں یاد رکھنا چاہیے کہ یہ ایک ناقابل عمل معاہدہ ہے جس کی بنیاد توانائی کے ایسے قومی منصوبے پر رکھی گئی ہے جو امکانی طور پر غیر قانونی ہے، اور جسے کانگرس نے ووٹ کے ذریعے پہلے ہی سے مسترد کر دیا ہے۔

دونوں جماعتیں گذشتہ نسل کے نو آزاد معیشت کے زمانے کے دوران ہی دائیں سمت کو جھکتی چلی گئیں۔ نمایاں حیثیت رکھنے والے ڈیموکریٹس اب کافی حد تک وہ کچھ بن چکے ہیں جنہیں ''اعتدال پسند ریپبلیکن'' کیا جاتا ہے اس دوران میں، ری پبلیکن پارٹی بھی اپنے مقام سے کافی دور لڑھک چکی ہے، ایسی حالت بناتے ہوئے جسے معزز قدامت پسند سیاسی تجزیہ نگار تھامس مین اور نارمن اورنسٹین نے ''روایت شکن بغاوت'' کا نام دیا ہے، جو کہ معمول کی پارلیمانی

سیاست سے عملاً انحراف ہے۔ دائیں سمت کے جھکاؤ کے ساتھ، ری پبلیکن پارٹی کی دولت اور مراعات کے ساتھ وابستگی بھی اس قدر شدّت اختیار کر چکی ہے کہ اب اس کی اصل حکمتِ عملیاں رائے دھندگان کے لئے زیادہ پُرکشش نہیں رہیں، یوں اسے مقبولیت کی نئی بنیادیں تلاش کرنی پڑیں، متحرک ہونے کے دیگر بہانے: انجیلی فرقے کے وہ عیسائی جو ''حضرت عیسٰی کی واپسی'' کے منتظر ہیں، مقامی باشندے جنہیں خوف ہے کہ ان کے ملک پر ''دوسرے لوگ'' قبضہ کر رہے ہیں، مروجہ سیاسی عقائد سے منحرف نسل پرست، حقیقی معنوں میں رنجیدہ وہ لوگ جو انکے مقاصد کے حوالے سے شدید غلط فہمی کا شکار ہیں، اور ان کی طرح کے دیگر لوگ جذبات سے کھیلنے والے سیاستدانوں کا آسان شکار ہیں اور ایک روایت شکن بغاوت کے لئے پہلے سے ہی تیار ہیں۔

حالیہ برسوں میں طاقتور ری پبلیکن حلقے اس بنیاد پر اُٹھنے والی آوازوں کو دبانے میں کامیاب ہو گئے تھے، جو کہ اس (جماعت) نے متحرک کر دی تھی۔ مگر یہ اب پرانی بات ہے۔ 2015 کے اختتام تک یہ طاقتور حلقے اس کی مقصد حاصل کرنے میں ناکامی پر کافی حد تک مایوسی واضطراب کا مظاہرہ کر رہے تھے، جیسا کہ ری پبلیکن کی بنیاد اور اس کی ترجیحات پر ان کی گرفت کمزور ہو چکی تھی۔

اگلے صدارتی انتخاب کے لئے چُنے گئے ری پبلیکن اُمیدواروں اور عہدیداروں نے پیرس میں زیر غور لائی گئی تجاویز کے حوالے سے کھلم کھلا حقارت کا اظہار کیا، حتیٰ کہ مذاکرات کی کاروائیوں میں شرکت سے بھی انکار کر دیا۔ اس وقت ہونے والی انتخابی سرگرمی میں نمایاں تین امیدواروں، ڈونالڈ ٹرمپ، ٹیڈ کروز، اور بن کارسن، نے زیادہ تر انجیلی فرقے کا موقف اپنایا: عالمی حدّت میں انسانوں کا کوئی کردار نہیں، اگر یہ واقعی ہو رہی ہے تو۔

دیگر اُمیدواروں نے اس معاملے سے نمٹنے کے لئے حکومتی اقدامات کو مسترد کر دیا۔ پیرس میں اوباما کے خطاب کے فوراً بعد، جس میں یہ عہد ظاہر کیا گیا تھا کہ امریکہ عالمی سطح پر اقدامات میں آگے آگے ہوگا، ری پبلیکن اکثریت کی حامل کانگریس نے اس کی تازہ تازہ قائم کردہ انوائرنمنٹل پروٹیکشن ایجنسی کے کاربن کے اخراج کے حوالے سے قواعد کو ووٹ کے ذریعے مسترد کر کے رکھ

دیا۔جیسا کہ اخبارات نے خبر لگائی ''یہ ان سو سے زائد (عالمی) رہنماؤں کے لئے اشتعال انگیز پیغام تھا کہ حکومت کی مکمل حمایت حاصل نہیں تھی''، ذرا نامکمل سی بات۔اسی اثنا میں لمار سمتھ، ہاؤس کمیٹی آن سائنس، سپیس، اینڈ ٹیکنالوجی کے ری پبلیکن سربراہ نے ان حکومتی سائنسدانوں کے خلاف جہاد تیز کر دیا جو حقائق عیاں کرنے کی جسارت کرتے ہیں۔

پیغام واضح ہے۔امریکی شہریوں پر ملکی سطح پر بہت بھاری ذمہ داری آ پڑی ہے۔

نیو یارک ٹائمز میں ایک ساتھی کی شائع شدہ تحقیق کے مطابق ''دو تہائی امریکی آلودہ گیسوں کے اخراج میں اضافے کی روک تھام کے حوالے سے بین الاقوامی سطح پر پابندی کے متقاضی کے معاہدوں میں شمولیت کے حق میں ہیں''۔اور پانچ میں سے تین امریکی ماحولیات کو معیشت کے مقابلے میں زیادہ اہم مسئلہ گردانتے ہیں۔تاہم، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔عوامی رائے کو مسترد کر کے رکھ دیا جاتا ہے۔حقیقت، ایک مرتبہ پھر، امریکیوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ رہی ہے۔ایک ناقص کارکردگی والے سیاسی نظام کو، جس میں مقبول عوامی رائے کو غیر اہم قرار دے دیا جاتا ہے، تبدیل یا درست کرنے کی ذمہ داری ان پر ہی عائد ہوتی ہے۔عوامی رائے اور حکومتی پالیسی کے درمیان عدم موافقت، اس معاملے میں، دنیا کے مقدر کے حوالے سے اہم مضمرات کی حامل ہے۔

ہمیں، ایک گذرے ہوئے ''سُنہرے دور'' کے حوالے سے، بلاشُبہ، کوئی غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے۔تاہم، جن پہلوؤں پر ابھی نظر ثانی کی گئی ہے وہ اہم تبدیلیوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔فعّال جمہوریت کی جڑوں کو کھوکھلا کرنا گذشتہ دور میں عالمی آبادی پر نو آزاد معیشت کی یلغار کے عمل کا جزو ہے۔اور ایسا صرف امریکہ میں ہی نہیں ہو رہا: یورپ میں اس کے اثرات بدتر ہو سکتے ہیں۔

ایسے واقعات جو کبھی رونما نہیں ہوں گے۔

اب ہم ان ایٹمی سائنسدانوں کی دوسری (اور روایتی) فکر کی طرف آتے ہیں جو یوم حشر کی گھڑی کو ہم آہنگ کرتے ہیں؛ ایٹمی ہتھیار۔ایٹمی جنگ کے موجودہ خطرے کی بدولت ان

کے جنوری 2015 کے اس فیصلے کو اچھا خاصا جواز مل جاتا ہے جس کے تحت انہوں نے گھڑی کی سوئی کو آدھی رات سے دو منٹ قبل کی جگہ پر لا کھڑا کیا تھا۔اس وقت سے لے کر اب تک جو کچھ ہو چکا ہے وہ بڑھتے ہوئے خطرے کو اور بھی واضح کر دیتا ہے، ایک ایسا مسئلہ جس پر، میرے خیال میں، لوگوں کی اتنی تشویش حاصل نہیں کی جا سکی۔

آخری وقت جبکہ یوم حشر کی گھڑی پر آدھی رات ہونے میں صرف تین منٹ رہ گئے تھے، 1983 میں آیا تھا، ریگن انتظامیہ کی ''ایبل آرچر ایکسر سائیزز'' کے وقت؛ یہ مشقیں روس پر حملے کی مصنوعی جنگی سرگرمیاں تھیں تاکہ اس کے دفاعی نظاموں کی آزمائش کی جا سکے۔حال ہی میں جاری کردہ روسی یادداشتوں سے منکشف ہوا ہے کہ روسی ان سرگرمیوں پر بہت متفکر تھے اور ان کے جواب میں تیاریاں شروع کر چکے تھے، جس کا سادہ معنوں میں صرف ایک ہی نتیجہ نکلنا تھا: خاتمہ۔

ہمیں ان بے سوچے سمجھے اور بے خطرے قسم کی مشقوں کے حوالے سے اور بھی بہت کچھ معلوم ہوا ہے، اور یہ کہ دنیا تباہی کے کتنے قریب پہنچ چکی تھی، جیسا کہ امریکی فوج اور خفیہ اداروں کے تجزیہ کار میلون گڈمین نے منکشف کیا جو کہ اس وقت سی آئی اے کا سربراہ ہونے کے علاوہ آفس آف دا سوویٹ افیئرز میں سینیئر تجزیہ کار بھی تھا۔ایبل آرچر نامی متحرک کرنے والی مشقوں کے علاوہ جنہوں نے کہ کریملن میں خطرے کی گھنٹی بجا دی تھی''، گڈمین لکھتا ہے، ''ریگن انتظامیہ نے روسی سرحدوں کے قریب غیر معمولی طور پر جارحانہ فوجی مشقوں کی اجازت بھی دے دی تھی، جن کی بدولت، بعض مواقع پر، روس کی جغرافیائی خود مختاری کی خلاف ورزی بھی ہوئی۔پینٹاگون کے خطرناک اقدامات میں قطب شمالی پر روسی راڈار کا معائنہ کرنے کے لئے امریکہ کے حربی چالوں والے بمباروں کی روانگی، اور روس کی طرف زمانہ جنگ کی پیش قدمیوں کے حوالے سے بحریہ کی ان علاقوں میں مشقیں کرنا شامل تھے جہاں امریکی جنگی بحری جہاز پہلے کبھی داخل نہیں ہوئے تھے۔اضافی خفیہ سرگرمیاں روسی اہداف پر بحریہ کے چونکا کر رکھ دینے والے فرضی (Simulated) حملوں پر مُشتمل تھیں''۔

www.MashalBooks.org

ہمیں اب معلوم ہو چکا ہے کہ ان دہشتناک دنوں میں دنیا کو امکانی ایٹمی تباہی سے ایک روسی افسر سٹینسلاف پیٹروف کے اس فیصلے کی بدولت بچا لیا گیا تھا کہ حکام بالا تک ان خودکار قسم کے سراغرساں نظاموں کی اطلاع نہ پہنچنے دی جائے جن کے مطابق روس میزائل حملے کے زد میں تھا۔ یوں پیٹروف روسی آبدوز کے کمانڈر واسلی آرخیپوف کے شانہ بشانہ کھڑا ہو گیا جس نے 1962 میں کیوبا کے میزائل بحران کے اس خطرناک لمحے میں ایٹمی تارپیڈو چھوڑنے کا حکم دینے سے انکار کر دیا تھا جب روسی آبدوزیں ان امریکی زیرآب تباہ کار جہازوں (Destroyers) کے حملوں کی زد میں تھیں جو انہیں کسی علیحدہ جگہ پر گھیرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

حال ہی میں منظر عام پر لائی جانے والی دیگر مثالیں پہلے سے ہولناک ریکارڈ کو مزید زرخیزی عطا کرتی ہیں۔ ایٹمی دفاع کے ماہر بروس بلیئر کے مطابق ''امریکہ کے کسی صدر کی طرف سے غیرارادی طور پر ایک حربی تدبیر کے تحت حملے کا فیصلہ 1979 میں اس وقت ہوتے ہوتے رہ گیا تھا جب نوراڈ (Norad) کو جلد خبردار کرنے والی تربیتی ٹیپ ایک مکمل روسی حربی حملے کی پیش گوئی کی مشق کرتے ہوئے غیرارادی طور پر ابتدائی انتباہ کے اصل نظام میں چل پڑی تھی۔ نیشنل سکیورٹی ایڈوائزر زبگنیو برزنسکی کو رات کے وقت دو مرتبہ طلب کر کے بتایا گیا کہ امریکہ حملے کی زد میں ہے اور وہ صدر کارٹر کو اس امر کی ترغیب دینے کے لئے فون اٹھانے ہی والا تھا کہ ایک مکمل جوابی حملے کی اجازت فوری طور پر درکار ہے جب تیسری مرتبہ فون کر کے اسے آگاہ کیا گیا کہ یہ غلط الارم تھا۔''

یہ نئی منکشف کردہ مثال 1995 کے ایک فیصلہ کن قسم کے واقعے کی یاد تازہ کر دیتی ہے جب امریکہ و ناروے کے ان راکٹوں کا فضائی منظر جو کہ سائنسی سامان لے کر جا رہے تھے کسی ایٹمی میزائل کے راستے کی طرح لگ رہا تھا۔ اس منظر نے روسیوں کو پریشان کر دیا جنہوں نے کہ فوراً صدر بورس یلسن تک رسائی حاصل کی، جس نے یہ فیصلہ کرنا تھا کہ آیا ایٹمی وار کیا جائے یا نہیں۔

بلیئر نے اپنے ذاتی تجربات سے بھی کچھ مثالوں کا اضافہ کیا ہے۔ ایک مثال 1967 کی مشرق وسطیٰ کی جنگ کی ہے جب ''ایٹمی ہتھیار لے کر جانے والے ایک طیارے کو بجائے مشق/

تربیت کے حوالے سے ایٹمی حکم دینے کے اصل حملے کا حکم بھجوا دیا گیا۔'' چند برس بعد، 1970 کی دہائی کے شروع میں اوماہا میں سٹریٹجک ائیر کمانڈ نے ''ایک مشق کا پیغام دوبارہ سے ارسال کر دیا... حملہ کرنے کا حکم ایک حقیقی دنیا میں دیے جانے والے اصل حکم کے طور پر۔'' دونوں صورتوں میں کوڈ یا خفیہ پیغام کی تصدیق کا عمل ناکام ہو گیا تھا؛ انسانی مداخلت نے حملے کو روک دیا۔ ''تاہم آپ کو یہاں اشارہ مل جاتا ہے۔'' بلیئر اضافہ کرتے ہوئے کہتا ہے، ''اس طرح کی گڑبڑ شاذونادر یا کبھی کبھار کی بات نہیں ہوتی تھی۔''

بلیئر نے یہ تبصرہ ائیرمین جون بارڈنے کی ایک رپورٹ کے ردعمل میں کیا تھا جس کی کہ امریکی فضائیہ نے ابھی حال ہی میں تصدیق کی ہے۔ بارڈنے اکتوبر 1962 میں اوکیناوا میں واقع امریکی فوج اڈے پر خدمات سرانجام دے رہا تھا، اُس وقت جب کیوبا میں میزائل بحران پیدا ہونے کے ساتھ ہی ایشیا میں بھی شدید تناؤ پایا جاتا تھا۔ امریکہ کے ایٹمی حملے سے خبردار کرنے والے نظام کا درجہ بڑھا کر ڈیفکون۔2 (DEFCON-2) کر دیا گیا تھا جو کہ ڈیفکون۔1 کے اس درجے سے عین پہلے آتا تھا جب ایٹمی میزائل فوری طور پر چلائے جا سکتے ہیں۔ اس بحران کے عروج کے وقت، 28 اکتوبر کو، میزائل چلانے والے عملے کو غلطی سے ایٹمی میزائل چلانے کے احکامات موصول ہو گئے تھے۔ انہوں نے ان کی تعمیل نہ کرنے کا فیصلہ کیا، ایک امکانی ایٹمی جنگ سے اجتناب کرتے اور پیٹروف اور آرخیپوف جیسی قابل احترام شخصیات کا ساتھ دیتے ہوئے جنہوں نے احکامات کی عدم تعمیل کا فیصلہ کر کے دنیا کو بچا لیا تھا۔

جیسا کہ بلیئر نے مشاہدے کی بنیاد پر بتایا، اس طرح کے واقعات نرالے نہیں ہوتے۔ ماہرین کی طرف سے تیار کردہ ایک تحقیق کے مطابق 1977 سے 1983 کی جائزہ لی گئی مدت کے دوران ہر برس خطرے کی درجنوں کے حساب سے غلط گھنٹیاں بجائی گئی تھیں؛ اس تحقیق کے آخر میں یہ نتیجہ نکالا گیا اس طرح کے واقعات ہر برس 43 تا 255 بار رونما ہوئے۔ تحقیق کے مُصنف سیتھ باوم نے مناسب الفاظ میں اختصار پیش کیا ہے؛

''ایٹمی جنگ ایک ایسی انوکھی جنگ ہے جو ہم کبھی نہیں دیکھ سکتے، ماسوائے اس مختصر لمحے

www.MashalBooks.org

میں جب یہ ہمیں موت کے گھاٹ اتار رہی ہوگی۔ ہم اس خطرے کو خود اپنی ذمہ داری سے ٹالتے ہیں۔ اب وقت آ گیا ہے اس خطرے کا سدّ باب کیا جائے کیونکہ ابھی ہم زندہ حالت میں ہیں۔

یہ رپورٹیں، جن کی دیگر مثالیں ہمیں ایرک سکلوسر کی کتاب ''کمانڈ اینڈ کنٹرول'' میں ملتی ہیں، زیادہ تر امریکی طریقوں/ضوابط کا احاطہ کرتی ہیں۔ روسی طریقہ کار/ضوابط میں، بلاشبہ، غلطی کے بہت زیادہ امکانات ہیں۔ اور اس شدید خطرے کا تو ذکر ہی کیا جو کہ دیگر نظاموں، خاص طور پر پاکستان کے نظام کی طرف سے لاحق ہے۔

''جنگ اب کسی طور ناقابل تصور نہیں رہی۔''

بعض اوقات خطرہ کسی قسم کے اتفاق یا حادثے کی بجائے مہم جوئی کی صورت میں نمودار ہوتا ہے، جیسا کہ ''ایبل آرچر'' والی مثال سے ثابت ہوتا ہے۔ اس کی سب سے زیادہ نمایاں مثال 1962 کے کیوبا کے میزائل بحران کی صورت میں سامنے آتی ہے، جب تباہی کا خطرہ حقیقت کے بہت قریب پہنچ چکا تھا۔ اس سے جس طرح نمٹا گیا وہ پریشان کُن ہے؛ اور اسی طرح وہ طریقہ بھی جس کے تحت معیشت کی عمومی وضاحت کی جاتی ہے۔

اس طرح کے وحشت انگیز ریکارڈ کو ذہن میں رکھتے ہوئے، یہ فائدہ مند رہے گا کہ حربی تدبیروں پر مبنی مباحثوں اور منصوبہ بندی پر نظر ڈالی جائے۔ ایک لرزا کر رکھ دینے والی مثال کلنٹن دور کے سٹراٹ کام 1995 (STRATCOM 1995) کی تحقیق بہ عنوان ''ایسنشلز آف پوسٹ۔ کولڈ وار ڈیٹرنس'' ہے۔ اس تحقیق یا جائزے کے تحت حملے میں پہل کرنے کا حق، حتیٰ کہ غیر ایٹمی ریاستوں کے خلاف بھی، برقرار رکھنے کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ اس کے تحت یہ وضاحت کی گئی ہے کہ ایٹمی ہتھیار مسلسل بروئے کار لائے جاتے ہیں، اس مفہوم میں کہ یہ ''کسی بھی بحران یا تنازعے کے دوران ناخوشگوار احساس پیدا کر دیتے ہیں۔'' یہ ایک طرح سے نامعقولیت اور انتقامی ذہنیت کا ایسا ''قومی تشخص'' اُجاگر کر دیتے ہیں جو دنیا کو دہشت زدہ کر دے۔

موجود عقیدے یا کٹر قسم کے نظریے کی کھوج ''انٹرنیشنل سیکیورٹی'' نامی اس جریدے کے ایک عدد اہم مضمون میں بھی لگائی گئی ہے جو کہ حربی عقیدے کے حوالے سے بہت ہی مستند قسم کا

جریدہ ہے۔ مُصنفین وضاحت کرتے ہیں کہ امریکہ ''حربی تدبیروں کے شعبے میں فوقیت'' کا عزم رکھتا ہے، یعنی کسی دشمن ملک کو انتقامی وار کرنے کا موقع ہی نہ ملے اوباما کی ''نئی تکون (New Triad)'' کے پس پردہ کارفرما منطق ہے (آبدوزوں اور زمینی مقامات پر نصب میزائلوں اور بمبار فوج کو مستحکم کرنا)، اور اس کے ساتھ ہی کسی جوابی حملے کا تدارک کرنے کے لئے میزائل کے ذریعے دفاع کی تدبیر۔ مُصنفین نے تشویش ظاہر کی ہے امریکہ کی طرف سے حربی میدان میں فوقیت کا مطالبہ چین کو اُکسا سکتا ہے کہ وہ اپنی ''استعمال میں پہل سے اجتناب'' کی حکمتِ عملی کو اپنی محدود پیمانے کی مزاحمت کو وسیع تر مزاحمت میں تبدیل کر کے ترک کر دے۔ مصنفین کے خیال میں وہ اگرچہ ایسا نہیں کرے گا مگر یقینی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ یہ امر واضح ہے کہ اس طرح کا عقیدہ، تناؤ اور تصادم کے حامل خطے میں خطرات میں اضافہ کر دیتا ہے۔

یہی کچھ مشرق کی سمت نیٹو کی توسیع کے حوالے سے کہا جا سکتا ہے جو کہ میخائل گوربا چوف کے ساتھ اس وقت کیے گئے زبانی وعدوں کی خلاف ورزی ہے جب روس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو رہے تھے اور اس (گورباچوف نے ایک متحدہ جرمنی کی نیٹو میں شمولیت کے معاملے پر اتفاق ظاہر کر دیا تھا، ایک حیرت انگیز قسم کی رعایت، اگر پوری صدی کی تاریخ کو سامنے رکھا جائے تو۔ مشرقی جرمنی کی طرف توسیع یکدم ہی کر دی گئی۔ آنے والے برسوں میں نیٹو روس کی سرحدوں تک پہنچ گئی؛ اب خاطر خواہ خطرات موجود ہیں کہ حتیٰ کہ یوکرین کو بھی شامل کر لیا جائے گا، جو کہ روس کی جغرافیائی حکمت عملی میں مرکزی اہمیت رکھتا ہے۔ آپ تصور کریں کہ امریکہ کا اس صورت میں کیا ردّ عمل ہوتا اگر ''وارسا پیکٹ'' ابھی تک فعّال ہوتا، لاطینی امریکہ کے بہت سے ممالک اس میں شامل ہو چکے ہوتے اور اب میکسکو اور کینیڈا شمولیت کی درخواست دے رہے ہوتے۔

اس سے ہٹ کر روس اور اسی طرح چین (اس کے ساتھ ہی امریکی حکمت عملیاں وضع کرنے والے بھی) کہ روسی سرحد کے قریب امریکی میزائلوں کا دفاعی نظام، دراصل، حملے میں پہل کا ایسا ہتھیار ہے جس کا مقصد حربی چالوں میں فوقیت حاصل کرنا ہے، یعنی انتقامی کاروائی سے بچاؤ۔ شاید ان کی یہ مُہم ہر لحاظ سے ناکام نظر آتی ہے، جیسا کہ بعض ماہرین کی منطق ہے۔ تاہم

www.MashalBooks.org

اہداف اس قدر یقینی نہیں ہو سکتے۔ اور روس کے جنگی ردّعمل کی کافی حد تک فطری وضاحت نیٹو کی طرف سے مغرب کو لاحق خطرے کے طور پر کی جاتی ہے۔

ہمارے معروف برطانوی یوکرینی محقق نے اس امر کی نشاندہی کی ہے جسے وہ ایک ''نتیجہ خیز جغرافیائی تضاد/تناقص'' کہتا ہے: یہ کہ نیٹو ''ان خطرات کا بندوبست کرنے کے لئے موجود ہے جو اس کے وجود کا ہی نتیجہ ہیں۔''

یہ خطرات اس وقت واقعی حقیقت پر مبنی ہیں۔ خوش قسمتی سے نومبر 2015 میں ترکی کے ایف۔ سولہ کی طرف سے ایک روسی طیارہ مار گرائے جانے کا نتیجہ کسی عالمی تنازعے کی صورت میں برآمد نہیں ہوا تاہم ایسا ہو سکتا تھا، خاص طور پر حالات کے مطابق۔ طیارہ شام میں بمباری کی مُہم پر نکلا ہوا تھا۔ یہ صرف 17 سیکنڈ کے لئے ترکی کی اس دور دراز سرحد سے ہوتا ہوا گذرا جو کہ شام کے اندر تک چلی جاتی تھی، اور واضح طور پر شام کی طرف ہی بڑھ رہا تھا، جہاں پہنچ کر وہ تباہ ہو گیا۔ اس کو مار گرانا غیر ضروری طور پر لاپرواہی کا مظاہرہ اور اشتعال انگیز عمل تھا اور ایک ایسا عمل جو عواقب سے محروم نہیں تھا۔

ردّعمل کے طور پر، روس نے اعلان کر دیا کہ اس کے بمبار طیارے اب سے لڑاکا جیٹ طیاروں کی معیت میں اڑیں گے اور یہ کہ وہ شام میں انتہائی جدید و پیچیدہ قسم کا طیارہ شکن میزائل سسٹم نصب کر رہا ہے۔ روس نے اپنے میزائل کروزر موسکاوا کو بھی حکم دیا کہ وہ اپنے دور مار فضائی دفاعی نظام (long-range air defense system) کے ساتھ ساحل کے قریب حرکت کرتا رہا، تا کہ تیار رہے جو ہمارے طیاروں کے لئے امکانی خطرہ ظاہر کر رہا ہو'' وزیر دفاع سرگئی شوئیگو نے اعلان کرتے ہوئے بتایا۔ یہ ساری صورتحال ایک مہلک قسم کے تصادم کا راستہ ہموار کرتی نظر آتی ہے۔

نیٹو۔ روسی سرحد پر بھی تناؤ کا ماحول برقرار ہے، بشمول اس فوجی نقل و حرکت کے جو سرحد کے دونوں جانب جاری ہے۔ یوم حشر کی گھڑی پر سوئی کو پر ہول انداز میں آدھی رات کے قریب کر دینے کے تھوڑے ہی عرصے بعد قومی اخبارات نے خبر دی کہ ''امریکہ کی فوجی گاڑیاں بُدھ کے

روز ایسٹونیا کے اس شہر سے گزری تھیں جو روس کے اندر تک چلا جاتا ہے، ایک ایسا علامتی فعل جو فریقین کے لئے سرد جنگ کے زمانے سے مغرب اور روس کے درمیان بدترین تناؤ کی صورتحال میں پیدا ہونے والے خطرات کو اجاگر کر رہا تھا۔ کچھ ہی عرصہ قبل ایک روسی جنگی طیارہ سیکنڈوں کے فرق سے ڈنمارک کی فضائی کمپنی کے کسی طیارے سے ٹکراتے ٹکراتے بچ گیا تھا۔ دونوں فریق روسی۔ نیٹو سرحد پر افواج کی تیزی سے نقل و حرکت اور تنصیب کے عمل میں شرکت کر رہے ہیں، اور دونوں کا یقین ہے کہ اب جنگ کسی طور ناقابل تصور نہیں رہی۔''

بقا کے امکانات

اگر ایسا ہی ہے تو دونوں فریق دیوانگی کی حدیں پھلانگ چکے ہیں، کیونکہ جنگ کے نتیجے میں سب کچھ تباہ ہو جائے گا۔ یہ بات عشروں سے تسلیم کی جا رہی ہے کسی بڑی طاقت کی جانب سے حملے میں پہل خود حملہ آور کی تباہی کا سامان بھی ہو سکتی ہے، حتیٰ کہ کسی انتقامی کاروائی کے بغیر، محض ایٹمی سردی کے اثرات کے تحت۔

تاہم یہ آج کی دنیا ہے۔ اور صرف آج کی ہی نہیں بلکہ وہ دنیا جہاں ہم ستر برس سے رہتے چلے آ رہے ہیں۔ دلیل کا عمل ہر لحاظ سے قابل توجہ ہے۔ جیسا کہ ہم نے مشاہدہ کیا ہے، کسی بھی ملک کے باشندوں کا تحفظ روایتی طور پر پالیسی سازوں کی اہم تشویش نہیں ہوتی۔ یہ نکتہ ایٹمی دور کے ابتدائی ترین ایام سے ہی درست ثابت ہوتا چلا آ رہا ہے، جب پالیسی کی تشکیل کے مراکز میں ایسی کوئی کوششیں، بظاہر کسی طرح کی واضح تفکرات بھی نہیں ہوتی تھیں کہ امریکہ کو لاحق واحد سنجیدہ امکانی خطرے کو مٹا کر رکھ دیا جائے، جیسا کہ ممکن ہو سکتا تھا۔ اس لئے معاملات آج ویسے ہی چلے آ رہے ہے، ایسے اطوار سے جن کا ابھی مختصر نمونہ پیش کیا جا چکا ہے۔

یہ ہے وہ دنیا جس میں ہم رہتے چلے آ رہے ہیں، اور آج بھی رہ رہے ہیں۔ ایٹمی ہتھیار فوری تباہی کا مسلسل منڈلاتا ہوا خطرہ ہیں، تاہم، اصولی طور پر ہمیں، کم سے کم یہ تو معلوم ہے کہ خطرے کی شدّت کیسے کم کی جا سکتی ہے، حتیٰ کہ اس کا خاتمہ بھی کیسے ہو سکتا ہے، ایک ایسی ذمہ داری جو ان ایٹمی طاقتوں نے اُٹھائی (اور نظر انداز کر دی) جنھوں نے ایٹمی عدم پھیلاؤ کے

www.MashalBooks.org

معاہدے (Non-proliferation Treaty) پر دستخط کئے تھے۔ عالمی حدّت کا خطرہ فوری نوعیت کا نہیں ہے، اگرچہ یہ طویل مدّت میں خوفناک شکل اختیار کرسکتی ہے اوراس میں اچانک اضافہ بھی ہو سکتا ہے۔ یہ خیال کہ ہم اس سے نمٹنے کی صلاحیت رکھتے ہیں مکمل طور پر واضح نہیں ہے، تاہم اس امر میں کوئی شک نہیں ہونا چاہیے کہ ہم اس کو جتنا ٹالتے رہیں گے، آفت اتنی شدید ہوتی چلی جائے گی۔

ایک معیاری قسم کی طویل المیعاد بقا کے امکانات اس وقت تک روشن نہیں ہوتے جب تک کہ ہماری سمت میں کوئی واضح تبدیلی نہیں آجاتی۔ ذمّہ داری کافی حد تک ہمارے اوپر ہی عائد ہوتی ہے، اوراسی طرح مواقع بھی ہماری دسترس میں ہیں۔

ماخذ:

http://chomsky.info/06122016

www.MashalBooks.org

9- عالمی حدّت اور مفادِ عامہ

7فروری، 2013 کو نوم چومسکی کا ایسٹ اسٹراؤڈزبرگ یونیورسٹی کے 800 سے زیادہ طالب علموں سے خطاب

بعض اوقات تعلیم اور مفادِ عامہ پر حملوں میں کافی نزدیکی ربط پایا جاتا ہے۔ اس کی ایک تازہ مثال موجود ہے جو کہ کافی حد تک چونکا کر رکھ دیتی ہے۔ بہت سی مثالوں میں سے ایک، جسے کہ ''انوائرنمنٹل لٹریسی امپروومنٹ ایکٹ'' کہا جاتا ہے، جس کو اب ''اے ایل ای سی'' کی جانب سے ریاستی قانون ساز اسمبلی میں پیش کرنے کی تجویز ہے، یعنی امریکن لیجسلیٹو ایکسچینج کونسل کی جانب سے۔ یہ ایک ایسا ادارہ (Lobby) ہے جسے بڑے کاروباری اداروں کی طرف سے عطیات فراہم کئے جاتے ہیں اور بہت زیادہ مالی وسائل رکھتا ہے، ایسی قانون سازی کرنے کے لئے جو کہ عطیات فراہم کرنے والی کارپوریشنوں اور انتہائی امیر طبقے کے مفادات اور ضروریات کی تکمیل میں معاون ہو۔ یہ بہت بااثر ادارہ ہے۔ ہاں تو یہ مخصوص قانون، جسے کہ اب تجویز کیا جارہا ہے، یعنی ''انوائرنمنٹل لٹریسی امپروومنٹ ایکٹ'' اس شے کو لازمی قرار دیتا ہے جسے کہ وہ ''متوازن تدریس'' کہتے ہیں، کے۔ 12 کلاس رومز میں ماحولیاتی سائنس کی متوازن تعلیم۔ ''متوازن تعلیم'' جیسا کہ آپ کو غالباً معلوم ہوگا، ایک ایسی علامتی اصطلاح ہے جو ماحولیاتی تبدیلی کے عمل سے انکار کی تدریس کے لئے استعمال کی جاتی ہے۔ یعنی حقائق پر مبنی ماحولیاتی سائنس، یا پھر اس مواد کو ''متوازن'' انداز میں پیش کرنا جو آپ کو سائنسی جرائد اور دیگر سنجیدہ سائنسی اشاعتوں میں پڑھنے کو ملتا ہے۔ اور ''اے ایل ای سی'' کے ان نمونوں پر مبنی قانون سازی جو پہلے

سے ہی بہت سی ریاستوں میں متعارف کرائی جا چکی ہے، غالباً جلد ہی شروع کر دی جائے گی۔

اے ایل ای سی کی یہ قانون سازی کی بنیاد ہارٹ لینڈ انسٹیٹیوٹ کے ایک منصوبے پر رکھی گئی ہے۔ یہ ادارہ جسے بڑی بڑی کارپوریشنوں سے عطیات ملتے ہیں، ماحولیات کے حوالے سے سائنسی اتفاق رائے کو مسترد کر دینے کے مقصد سے وابستہ رہتا ہے۔ اس ادارے کا ایک منصوبہ وہ ہے جسے ان کے اپنے الفاظ میں ''کے 12 کلاس رومز کے لئے عالمی حدّت کے موضوع پر نصاب'' کہا جاتا ہے۔ اور اس کا مقصد (میں انہی کے الفاظ نقل کر رہا ہوں) ''اس امر کی تدریس کرنا ہے کہ اس حوالے سے ایک اہم تنازعہ پایا جاتا ہے کہ آیا انسان موسم کی تبدیلی کا سبب بن رہے ہیں یا نہیں۔'' بلاشبہ یہ سب کچھ ناقدانہ سوچ کی حوصلہ افزائی اور ہر طرح کی اچھی چیزوں کے حوالے سے مبالغہ آرائی کے لبادے میں کیا جارہا ہے۔ یہ دراصل بچوں کو بالکل عمومی انداز میں ارتقائی عمل اور سائنس کی تعلیم پر حال ہی میں کئے جانے والے حملے کی طرح بلکہ اس کی ایک مثال ہے۔ ان سارے نظریات کو اشتعال انگیز طور پر متنازعہ نظریات کی بدولت متوازن کیا جائے گا۔ اور بلاشبہ ایک تنازعے کا وجود پایا جاتا ہے۔ ایک طرف ان سائنس دانوں کی اکثریت، دنیا کی عظیم ترین قومی سائنسی درسگاہیں، سائنس کی پیشہ ورانہ تنظیمیں، پیشہ ورانہ سائنسی جرائد، آئی پی سی سی (انٹر گورنمنٹل پینل آن کلائمنٹ چینج)، سائنسدانوں کی عمومی گروہ بندیاں ہیں جو اس صورتحال سے نبرد آزما ہیں۔ ان سب کا اس امر پر اتفاق رائے پایا جاتا ہے کہ عالمی حدّت کا عمل جاری ہے، یہ کہ اس میں کافی حد تک انسان ملوث ہیں، یہ کہ صورت حال بہت گھمبیر اور ممکنہ طور پر خطرناک ہے، اور یہ کہ بہت جلد، ہوسکتا ہے چند عشروں میں، دنیا اس نقطہ آغاز (Tipping Point) پر پہنچ جائے جب اس عمل میں تیزی سے اضافہ ہونے لگے گا اور اس کو واپس نہیں پھیرا جاسکے گا۔ زندگی کی اختتام کا امکان، جیسا کہ ہمیں معلوم ہے، ایک معیاری انسانی زندگی کے امکانات پر شدید اثرات رونما ہوں گے۔ اصل میں ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا ہے کہ اس طرح کے پیچیدہ معاملات پر اتنا زبردست سائنسی اتفاق رائے پایا جائے۔

اب حقیقت یہ ہے کہ اس پر اتفاق رائے نہیں رہا۔ ایک تنازعہ کھڑا ہو گیا ہے۔ اور ذرائع

www.MashalBooks.org

ابلاغ سے ملنے والی عمومی خبروں میں ایک تنازعہ پیش کیا جاتا ہے، جس کے ایک طرف اتفاق رائے رکھنے والے سائنسدانوں کی اکثریت، قومی سطح کے سائنسی ادارے، سائنسی جرائد وغیرہ ہیں اور دوسری جانب شک وشبہے میں مُبتلا لوگ۔ دراصل شکوک وشبہات کا اظہار کرنے والوں میں چند ایک ایسے معزز سائنسدان بھی شامل ہیں جو اس حوالے سے خبردار کررہے ہیں کہ ابھی بہت کچھ نامعلوم ہے، جو کہ درست ہے۔ یہ حقیقت کہ ابھی بہت کچھ نامعلوم ہے، اس امر کی غمازی کرتی ہے کہ ضروری نہیں حالات اتنے غیر موافق ہوں جتنا کہ اتفاق رائے سے دعویٰ کیا جاتا ہے یا ہوسکتا ہے کہ اس سے بھی بدتر ہوں۔ اگرچہ اس کا مطلب یہی ہے کہ ابھی بہت کچھ نامعلوم ہے مگر صرف اور صرف پہلا متبادل یا امکان اجاگر کیا جاتا ہے (یعنی ضروری اختراع کردہ مباحثہ سے کوئی پہلو اوجھل رکھا جاتا ہے۔ حقیقت میں سائنسدانوں کے اندر شکوک کا اظہار کرنے والے بڑی تعداد میں موجود ہیں، انتہائی قابل احترام موسمیاتی سائنسدان جو آئی پی سی سی کی معمول کی رپورٹوں کو بہت زیادہ متنازعہ سمجھتے ہیں۔ اس میں، مثال کے طور پر، میری اپنی یونیورسٹی، ایم آئی ٹی میں موسمیاتی تبدیلی پر تحقیق کرنے والے سائنسدانوں کا ایک گروہ بھی شامل ہے۔ وہ کئی برسوں سے متواتر درست ثابت ہوتے چلے آرہے ہیں۔ اتفاق رائے بظاہر بہت ہی محتاط قسم کا ہے۔ حالات بہت بدتر ہیں۔ تاہم ان کا عوامی سطح پر مباحث میں بہت کم تذکرہ ہوتا ہے، اگرچہ ان سائنسی تحریروں میں بہت نمایاں طور پر ہوتا ہے جو آپ کی نظر سے گذر سکتی ہیں اگر آپ سائنسی جرائد کا مطالعہ کرتے ہیں تو۔

جی ہاں، ہارٹ لینڈ انسٹیٹیوٹ اور اے ایل ای سی بڑی بڑی کارپوریشنوں کی طرف سے چلائی جانے والی وسیع مہم کا حِصّہ ہیں۔ سائنسدانوں کے اس تقریباً مکمل اتفاق رائے کو شکوک کی زد میں لانا کہ انسانی سرگرمیوں کے عالمی حدّت پر وسیع اثرات مرتب ہورہے ہیں، ہولناک نتائج پیدا کرسکتا ہے اور وہ بھی مستقبل قریب میں۔ یہ مُہم اب کوئی راز نہیں ہے۔ اس کا کھلے عام اعلان کیا جاتا ہے، عوامی سطح پر اعلان کیا جاتا ہے، جس میں زیرزمین ایندھن کے ذخائر سے منسلک صنعتوں کی طرف سے رائے عامہ پر اثرانداز ہونے کے لئے قائم کردہ تنظمیں (Lobbying Organization) بھی شامل ہیں، یعنی امریکن چیمبر آف کامرس، بڑے کاروباری ادارے، اور دیگر۔ اس مُہم کے رائے عامہ پر مخصوص اثرات رونما ہوئے۔ اس لئے امریکہ میں عام لوگوں میں ان سرگرمیوں کے خطرات کے حوالے سے اتنی تشویش نہیں پائی جاتی جو ماحول پر اثرانداز ہوتی ہیں، جتنی کہ دیگر ممالک میں، تاہم دراصل، ایک محتاط طریقے سے کی گئی تحقیق سے ثابت ہوتا ہے کہ عوامی رائے بہ نسبت پالیسی کے سائنسی اتفاق رائے سے بہت قریب ہے، جو کہ ایک دلچسپ حقیقت ہے۔ اور بلاشبہ یہی وجہ ہے کہ بڑی بڑی کارپوریشنوں کی اکثریت تعلیمی نظام پر حملے کررہی ہیں تاکہ عوام کی طرف سے سنجیدہ سائنسی تحقیق کے نتائج پر توجہ مرکوز کرنے کا رجحان تبدیل کیا جاسکے۔

آپ نے غالباً سنا ہوگا کہ ری پبلیکن نیشنل کمیٹی کے سردیوں کے اجلاس میں، جو چند ہفتے قبل ہوا تھا، گورنر بوبی جنڈل نے ری پبلیکن قیادت کو ان الفاظ میں خبردار کیا تھا، ''لازم ہے کہ ہم ایک احمق جماعت بننے سے باز آجائیں، ہمیں رائے دہندگان کی ذہانت کی توہین کرنے سے بھی لازماً باز آجانا چاہیے۔'' دراصل، اے ایل ای سی اور اس کی پُشت پناہی کرنے والے بڑے کاروباری ادارے مختلف نقطہ نظر رکھتے ہیں۔ وہ اس ملک کو احمقوں کا مُلک بنانا چاہتے ہیں۔ اور ہوسکتا ہے کہ اگر ایسا ہوجائے تو وہ خود بھی اس احمق جماعت میں شمولیت اختیار کرلیں جس کے حوالے سے جنڈل نے خبردار کیا تھا۔

بڑے بڑے سائنسی جرائد اس امر کو بڑی وضاحت سے عیاں کرتے ہیں کہ یہ سب کس قدر ورائے حقیقت (Surreal) لگتا ہے، یہ کس طرح کہا جاسکتا ہے کہ مشاہدہ کرنے والوں کو یہ جس طرح نظر آرہا ہے، جو زمین پر ہورہا ہے، درحقیقت دوسرے ممالک میں بھی اسی طرح لگتا ہے۔ لہٰذا ایک سائنسی جریدے، اہم ہفتہ وار جریدے کی، جو کہ امریکن ایسوسی ایشن فار دا ایڈوانسمنٹ آف سائنس کا جریدہ ہے، مثال لیتے ہیں۔ کوئی دو ہفتے قبل اس میں تین خبریں ساتھ ساتھ شائع ہوئیں۔ ایک کے مطابق سال 2012 امریکہ کی تاریخ کا گرم ترین سال تھا، پورے ملک کو ہر طرح کے نقصان دہ اثرات کی لپیٹ میں لے لینے والا، قحط، آندھیاں، طوفان وغیرہ وغیرہ۔ اور، جیسا کہ

اس میں یہ نکتہ عیاں کیا گیا، یہ ایک طویل عرصہ تک جاری رہنے والا رجحان ہے۔ دوسری خبر یونائیٹڈ سٹیٹس گلوبل کلائمنٹ چینج ریسرچ پروگرام کی ایک نئی تحقیق کے بارے میں تھی، جس میں انسانی سرگرمیوں کی بدولت موسمیاتی تبدیلی کے تیز ہوتے ہوئے عمل کے حوالے سے چند نئے شواہد پیش کئے گئے تھے اور اس کے ساتھ ہی امکانی طور پر شدید اثرات کو بھی زیر بحث لایا گیا تھا۔ تیسری خبر سائنس پالیسی پر بننے والی کمیٹیوں کی صدارت کے لئے نئی تقرریوں سے متعلق تھی جن کا چناؤ ایوان نمائندگان کی طرف سے کیا گیا تھا جہاں رائے دہندگان کی قلیل تعداد نے ری پبلیکنز کی وسیع اکثریت کا انتخاب کیا، جو کہ حالیہ برسوں میں ڈیموکریٹس سسٹم کے پرخچے اڑا دینے کے نتیجے میں ہوا۔ پنسلوانیا میں، جیسا کہ آپ کو غالباً معلوم ہوگا، لوگوں کی خاطر خواہ اکثریت نے ڈیموکریٹس کو ووٹ دیا تھا مگر انہوں نے ایوان کی بمشکل ایک تہائی سے زائد نشستیں حاصل کیں۔

چنانچہ اب ہمارے پاس تین سائنس کمیٹیاں ہیں۔ یہ ساری کی ساری کمیٹیاں اس امر کی تردید کرتی ہیں کہ موسمیاتی تبدیلیوں کے پس پردہ انسانوں کا ہاتھ ہے۔ تین میں سے دو تو اس سے بھی انکاری ہیں کہ موسمیاتی تبدیلی واقع ہو رہی ہے۔ اور ان میں سے ایک جو کہ ہر شے سے ہی انکاری ہے زیر زمین ایندھن سے منسلک صنعت کی طویل عرصہ سے ترغیب کار (Lobbyist) ہے۔ جریدے کے اسی شمارے میں ایک تفصیلی قسم کا تکنیکی مضمون بھی ہے جس میں اس امر کا ایک نیا ثبوت دیا گیا ہے کہ ہو سکتا ہے ہم ناقابل واپسی نقطہ آغاز (Tipping Point) سے ہولناک طور پر قریب پہنچ چکے ہوں۔ یہ ہے وہ تصویر جس سے پتہ چلتا ہے کہ کیا ہو رہا ہے، اس تناظر میں جس میں کہ اے ایل ای سی کی وہ کاوش متعارف کرائی جا رہی جس کے تحت اس امر کو یقینی بنایا جائے گا کہ ہم ایک ''احمق قوم'' بن کر رہ جائیں۔

ان کے لئے جنہیں آدم اسمتھ نے ''انسان کے آقاؤں'' کا نام دیا ہے، یہ بہت ضروری ہے کہ ہم ان کے قلیل مدتی منافع کے لئے احمق قوم بن کر رہ جائیں نتائج وعواقب جائیں بھاڑ میں۔ ان کا مفادِ عامہ کا تصور یہی ہے جسے وہ عملی شکل میں نافذ کرنا چاہتے ہیں۔ یہ عصر حاضر کے رائج عقائد کی اہم خصوصیات ہیں، جنہیں بعض اوقات ''منڈی کے بنیادی عقائد'' کا نام دیا جاتا

ہے، انہی عقائد کے اندر وہ کچھ مُضمر ہے کہ جس کی بدولت آپ کو وہ سب برداشت کرنا جو اس وقت ہو رہا ہے۔

اے ایل سی اور اس کو عطیات فراہم کرنے والے کاروباری ادارے عوام کو اس امر کی یقین دہانی کرانے کی اہمیت سے آگاہ ہیں کہ سرکاری تعلیم کے تحت بچوں کو یہ تربیت دی جائے کہ وہ ایک احمق قوم سے تعلق رکھتے ہیں اور یوں سائنس یا معقول سوچ کی بدولت گمراہ نہ ہو جائیں۔ بہت خوب، میں نے ابھی جو کچھ کیا ہے وہ عوامی آراء اور عوامی پالیسی کے درمیان کافی نمایاں تضادات/تفریقات کی اب تک کی کوئی واحد مثال نہیں ہے۔ یہ ایک اہم نکتہ ہے۔ یہ ہمیں موجودہ امریکی جمہوریت کی صورتحال کے بارے میں اور اس کے ہمارے نزدیک اور دراصل دنیا کے نزدیک مفہوم کے بارے میں بہت کچھ بتاتا ہے۔

تعلیم اور آزادانہ سوچ پر بڑی کارپوریشنوں کا حملہ، جس کی یہ اتفاق سے واحد حیرت انگیز عکاسی ہے، ہمیں اور بھی بہت کچھ بتاتا ہے۔

اب ہم پالیسی معاملات کی طرف آتے ہیں۔ موسمیاتی پالیسی میں، امریکہ، جو کہ دنیا کا امیر ترین ملک ہونے کے علاوہ بہت سے اور معاملات میں بھی فوقیت رکھتا ہے، بہت سے ممالک سے پیچھے ہے۔ میں ایک حالیہ سائنسی ریویو کا حوالہ دوں گا۔ ''109 ممالک ایسے ہیں جنہوں نے قابل تجدید توانائی کے حوالے سے کسی نہ کسی شکل میں پالیسی کا نفاذ کیا ہے اور 118 ممالک نے اس حوالے سے اہداف متعین کر دیے ہیں۔ اس کے برعکس، امریکہ نے قابل تجدید توانائی کو فروغ دینے کے لئے قومی سطح پر کسی قسم کی مستحکم پالیسیاں اختیار نہیں کیں۔'' یہ ایک رواں عمومی منظر ہے۔ یا پھر اسی طرح کیا امریکہ نے دیگر ایسے وسائل اختیار کئے ہیں جن کی ان ممالک کی طرف سے حصول کی کوشش کی جا رہی ہے جن کی اپنی قومی پالیسیاں ہیں، یعنی امریکہ کے علاوہ تقریباً ہر ملک کی طرف سے۔

چند ایک اقدامات کئے جا رہے ہیں مگر بے ربط طریقے سے اور بغیر کسی منظم قومی ارادے کے، جس کی وجہ سے کچھ اقدامات کافی حد تک غیر موثر ہو کر رہ گئے ہیں۔ اب یہ ہمارے

www.MashalBooks.org

لئے، ہمارے بچوں کے لئے، ان کے بچوں کے لئے، ہوسکتا ہے اتنی دور نہ جانا پڑے، اور ساری دنیا کے لئے، کوئی معمولی سا مسئلہ نہیں ہے، اگر امریکی اثر ورسوخ کے اس قدر وسیع پیمانے پر غلبے کو پیش نظر رکھا جائے تو۔ بلا شُبہ، اس اثر ورسوخ میں کمی آرہی ہے۔ اور ایسا طویل عرصے سے ہوتا چلا آرہا ہے کیونکہ طاقت کے مآخذ عالمی سطح پر زیادہ متنوع ہوتے جارہے ہیں۔ تاہم اسے ابھی تک کسی آزمائش کا سامنا نہیں ہے۔ یہ بھی قابل ذکر ہے کہ دنیا میں آبادی کے ایسے حلقے بھی ہیں جو کہ اس طرح کے خطرناک مضمرات کے حوالے سے کچھ کرنے کی کوششوں میں سب سے آگے ہیں۔ ایسا ساری دنیا میں ہورہا ہے۔ یہ مقامی باشندوں کی بچی کھچی نسلیں ہیں۔ یہ تقریباً ہر جگہ ہی درست ثابت ہورہا ہے، چاہے وہ قبائلی معاشرے ہوں، پہلی پہلی اقوام ہوں، علاقے کے اصل باشندے ہوں، یا جو بھی ہوں۔

یہ عالمی سطح پر ایسے رہنما ہیں جو کہ ان انتہائی سنجیدہ قسم کے معاملات کی طرف دنیا کی توجہ مبذول کروانے کی کوشش کررہے ہیں۔ اصل انسانی تاریخ میں ایسا پہلی مرتبہ ہوا کہ انسان خود اپنے آپ کو تباہ کرنے کے قریب پہنچ چکے ہیں، اور وہ وقت اتنا دور نہیں رہا۔ وہ ممالک جہاں شروع سے ہی آباد اصل باشندوں کی تعداد کافی زیادہ ہے، اکثریت میں یا اکثریت کے قریب، ایسے ممالک نے اپنے طور پر بہت سخت اقدامات کئے ہیں۔ بولیویا، جہاں ایسے باشندوں کی اکثریت ہے، ان ممالک میں اس حوالے سے قانون سازی کی گئی ہے تاکہ فطرت کے حقوق محفوظ رکھے جائیں، جیسا کہ اس کو عنوان رکھا گیا ہے۔ ایکویڈور میں جہاں تیل کے وسیع تر ذخائر ہیں، حکومت مقامی باشندوں کے دباؤ میں آکر کوشش کررہی ہے کہ ان ذخائر کو زیر زمین ہی رہنے دیا جائے۔ بلکہ درحقیقت اب وہاں کی حکومت یورپین یونین سے بھی کچھ مدد حاصل کرنے کی کوشش کررہی ہے۔ میرا نہیں خیال کہ وہ امریکہ سے بھی درخواست کریں گے کہ وہ تیل کو زیر زمین پڑا رہنے کی کوششوں میں ان کی معاونت کرے تاکہ ہم سب اس کی تباہ کاریوں سے محفوظ رہیں۔ ہم اس کے برعکس کررہے ہیں، حقیقت میں، عین پنسلوانیا کے اندر، اس صورتحال کا اتنا عادی ہونے کے لئے جتنا کہ ممکن ہو سکے تاکہ یہ آئندہ نسلوں کے لئے اور پوری دنیا کے لئے ہر ممکن حد تک

نقصان دہ بن جائے۔ یہی کچھ باقی دنیا میں آباد اصل باشندوں کے ساتھ ہورہا ہے۔ انڈیا، عملی طور پر، اس صورتحال سے جنگ کی حالت میں ہے۔ کولمبیا، آسٹریلیا، جہاں کہیں بھی آپ جائیں، کینیڈا ہر جگہ مقامی باشندے، نوع انسانی کو بچانے کی بھرپور کاوشیں کررہے ہیں جبکہ تعلیم یافتہ اور مُہذب خِطے نوع انسانی کو تباہ کرنے کے درپے ہیں۔

ایندھن کے زیر زمین وسائل کو (پانی، ریت اور دیگر کیمیائی اجزا کے مرکب کے دباؤ کی بدولت) کھود کر باہر نکالنے کے ایک عمل (Fracking) کے حوالے سے سوال۔

چومسکی: ایک بہت ہی دلچسپ موضوع، جس کا میرے خیال میں ابھی ذکر ہوا ہے کہ ایکویڈور میں، جہاں پر کہ اصل مقامی باشندے بڑی تعداد میں رہ رہے ہیں، وہاں پر سوچ یہ ہے کہ کیوں نہ ایندھن کے زیر زمین وسائل کو کھود کر نکالا جائے۔ ان کے پاس تیل کے وسیع تر ذخائر ہیں۔ وہاں پر حکومت کی کوشش یہی ہے کہ تیل کو استعمال کرنے سے گریز کیا جائے اور اسے زیر زمین ہی پڑا رہنے دیا جائے کیونکہ وہاں کے اصل مقامی باشندوں کی سمجھ یہ ہے کہ بہتر یہی رہے گا کہ ہم اسے استعمال نہ کریں کیونکہ اس کا ہر جزو جو ہم استعمال کرتے ہیں ہمارے لئے نقصان دہ ہے۔ یہ ہمارے بچوں کے لئے نقصان دہ ہے۔ یہ دنیا کے لئے نقصان دہ ہے، اور امکانی طور پر شدید نقصان دہ۔ تو ایک امکان تو یہ ہے کہ وہ موقف اپنایا جائے جو کہ ایکویڈور میں مقامی قبائل کا ہے اور بالکل یہی دنیا کے اکثر علاقوں میں آباد لوگوں کا ہے۔ دوسرا یہ کہ وہ موقف اپنایا جائے جس پر کہ کیا کہتے ہیں، اوباما اور رومنی مکمل طور پر اتفاق کرتے ہیں: ''ہمیں وہ سارا تیل، وہ سارے ہائیڈرو کاربن وسائل زمین سے نکال لینے چاہئیں جو کہ وہاں پہلے سے موجود ہیں، بڑی تعداد میں۔ ہمیں ان سب کو اس قدر کفایت سے استعمال کرنا چاہیے جس حد تک کہ ممکن ہے۔ اس طرح سے ہمیں توانائی کے معاملے میں سو برس تک خود انحصاری حاصل ہو جائے گی۔ دنیا ایک سو برس کے بعد کیسی لگے گی؟ یہ کسی اور کا مسئلہ ہے، ہمارے سوچنے کا نہیں۔ جو چیز اہمیت رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ میں کل تک کتنا پیسہ کما سکتا ہوں۔'' اتفاق سے، تیل کے معاملے میں خود انحصاری کا معاملہ بالکل ہی بے معنی ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ، اگر ہمارا سارا کا سارا تیل بھی، کیا کہتے ہیں، سعودی

www.MashalBooks.org

عرب سے آئے تو ہم اس سے زیادہ انحصار کی حالت میں نہیں ہوں گے جس قدر کہ ہم آج ہیں۔ آپ کو یہ سب آسانی سے سمجھ آ سکتا ہے۔ امریکہ کی مشرق وسطیٰ کے حوالے سے پالیسیاں، کیا کہتے ہیں، 1950 کی دہائی میں آئزن ہاور کے دور میں بھی بالکل ایسی ہی تھیں، جب ہم مشرق وسطیٰ سے کوئی تیل نہیں لے رہے تھے۔ دراصل ہم تیل برآمد کرنے والوں کی صف میں سب سے آگے تھے۔ اور اس وقت، 1950 کے عشرے میں امریکہ نے تیل کے مقامی ذخائر کو مکمل طور پر صرف کر لینے کا فیصلہ کیا تھا تا کہ ٹیکساس کے تیل پیدا کرنے والے اداروں کو منافع حاصل ہو سکے۔ یوں مقامی طور پر پیدا ہونے والے تیل، ٹیکساس کے تیل کو استعمال کرنے کا فیصلہ کیا گیا، سعودی عرب سے سستا تیل منگوانے کی بجائے۔ کیونکہ جب ٹیکساس کے تیل پیدا کرنے والے ادارے زیادہ منافع کمائیں گے تو پھر ہم زمین کے اندر مزید کھدائیاں کر سکیں گے، جو دوبارہ تیل سے بھرے کنویں عیاں کر دیں گے جنہیں بعد ازاں "توانائی کے کلیدی (Strategic) ذخائر کا نام دیا گیا۔

تاہم مشرق وسطیٰ پر گرفت اور مشرق وسطیٰ کے تیل کے کنوؤں پر گرفت کے حوالے سے پالیسیاں بالکل یکساں تھیں۔ لہٰذا توانائی میں خود انحصاری کے معاملے کو ایک طرف رکھ دیں۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ "آیا ہم حتی الامکان حد تک ہائیڈروکاربن، قدرتی گیس اور تیل کے ذخائر کھود نکالنے کے عواقب کے لئے تیار ہیں۔ بہت خوب، آپ ان عواقب یا نتائج کا بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر، زیر زمین وسائل کو پانی، ریت اور دیگر کیمیائی اجزا کے مُرکب کے تیز دباؤ کے ذریعے کھود کر باہر نکالنے کے ایک عمل (Fracking) کو ہی لے لیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ اس عمل کے مقامی سطح پر بہت سے اثرات ہوتے ہیں۔ آپ کو معلوم ہوگا، مجھے یقین ہے کہ آپ سب کو اس حوالے سے علم ہے۔ اس سے پانی کی فراہمی کا عمل متاثر ہوتا ہے، آپ کو معلوم ہوگا، اس کے زہریلے اثرات کا۔ یہ بہت زیادہ توانائی جذب کرنے والا عمل ہے۔ قدرتی گیس تیل کی نسبت بہت زیادہ با کفایت (Efficient) ہوتی ہے، آپ کو معلوم ہوگا، اس میں کاربن ڈائی آکسائیڈ کا تناسب بھی کم ہوتا ہے، مگر یہ میتھین کا اخراج بھی کرتی ہے، جو کہ کاربن ڈائی آکسائیڈ سے بھی بدتر اثرات کی حامل ہوتی ہے۔ اور اسے نکالنے پر توانائی بھی بہت صرف ہوتی ہے۔ تاہم،

اس کے علاوہ دیگر اثرات بھی ہوتے ہیں، مثلاً آپ جانتے ہیں، کہ اقتصادی دلائل کے مطابق ایندھن کے ذخائر اس طرح سے کھود نکالنے اور گیس پر انحصار کرنے سے ہمیں ایک عبوری مدت مل جائے گی، جس دوران ہمارے پاس سستی توانائی میسر ہو گی جس کی بدولت ہم اس قابل ہو جائیں گے کہ قابل تجدید توانائی کے وسائل کی طرف پیش رفت کریں۔ ٹھیک ہے، لہٰذا، اس طرح سے۔۔۔

تاہم اس طریقہ کار یا حکمت عملی سے بھی ایک دو مسائل جنم لے سکتے ہیں۔ بنیادی مسئلہ یہ ہے: اس کے الٹے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ اگر آپ کے پاس سرمایہ دارانہ نظام کے اندر ہائیڈروکاربن کے سستے ذخائر ہوں تو پھر قابل تجدید توانائی کے وسائل فروغ دینے کے لئے آپ کے پاس کوئی محرّک نہیں ہوگا۔ یوں ہائیڈروکاربن کے ذخائر جتنے سستے ہوں گے آپ قابل تجدید توانائی کے وسائل کی طرف رجوع کرنے میں اتنی ہی تاخیر کریں گے جو کہ ہمیں اپنی بقا کے لئے جلد از جلد شروع کرنے کی ضرورت ہے۔ اور دوسرے ممالک میں کیا ہو رہا ہے؟ میں نے پہلے بھی ذکر کیا ہے کہ دنیا کے 110 ممالک میں سے امریکہ واحد ملک ہے جس کی کوئی "قومی توانائی پالیسی" نہیں ہے۔ اگر آپ ادھر اُدھر نگاہ ڈالیں تو باقی ممالک میں بہت کچھ ہو رہا ہے، جیسے ایکویڈور میں۔ میں نے آپ کو بتایا تھا کہ وہ اپنے ذخائر کو زیر زمین پڑا رہنے دینے کے لئے کیا کوشش کر رہے تھے۔ چین، جو کہ بہت زیادہ آلودگی پھیلا رہا ہے، وہ بھی اب تک شمسی توانائی کے شعبے میں عالمی سطح پر بہت آگے بڑھ چکا ہے۔ وہ اب بہت سے سولر پینل بنا رہا ہے، اور جدید سولر پینل، جو کہ بہت جدید و پیچیدہ قسم کی ٹیکنالوجی پر مُشتمل ہیں۔ تو وہ ٹیکنالوجی میں بھی آگے آگے ہیں اور کام بھی وسیع پیمانے پر کر رہے ہیں۔ ہم پیچھے ہوتے جا رہے ہیں۔ جرمنی اور ڈنمارک بھی قابل تجدید توانائی کے میدان میں بہت آگے جا رہے ہیں۔ ان کا شمار امیر ممالک میں ہوتا ہے۔ اس لئے بہت سے کام ایسے ہیں جو کئے جا سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ کوشش کی جائے کہ جتنا نقصان ہو سکتا ہے ہونے دیا جائے اور پھر اصلاح کے کام کو جس حد تک ممکن ہو تاخیر کا شکار کر دیا جائے جس کا مطلب ہے کہ اس وقت تک جب تک سب کچھ ختم نہ ہو جائے۔ یہی وہ عمل ہے جسے کھود کر نکالنے کا

www.MashalBooks.org

عمل کہتے ہیں۔ اور اس پر قومی سطح کا اتفاق رائے پایا جاتا ہے۔ اوباما سے لے کر رومنی تک اور بیچ میں باقی سب بھی آجاتے ہیں۔ میرے خیال میں، یہ مریضانہ روّیہ ہے، صاف صاف کہا جائے تو۔

ماخذ:

www.youtube.com/watch?v=wgHqwqpQvVg

www.MashalBooks.org

10- نوم چومسکی: ''دونسلوں کے بعد ایک منظم انسانی معاشرے کا وجود ناپید ہوسکتا ہے''

از ربرٹ ہیکٹ، 12 فروری، 2019

کیمپس کے اندر واقع اس کے دفتر کی پروقار سادگی، ایک چھوٹی سی گول میز بمعہ سیدھی پُشت کی بے شمار کرسیوں کے اور ایک صاف سُتھرے ڈیسک پر دھرا لیپ ٹاپ، دنیا کے صف اوّل کے عوامی دانش کے طور پر اس کی ساکھ کے بالکل برعکس نظر آتی ہے۔ اب 90 برس کی عمر تک پہنچنے کے بعد بھی نوم چومسکی نے لکھنے کا کام جاری رکھا ہوا ہے، جبکہ یونیورسٹی آف ایریزونا میں سیاست اور عالمی بحرانوں پر شریک استاد کے طور پر خدمات اس کے علاوہ ہیں۔

لسانیات کے شعبے میں مثال قائم کر دینے والے کام کے علاوہ، چومسکی امریکہ کی خارجہ پالیسی اور انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں اور پوری دنیا میں فوجی جارحیت کی کاروائیوں کے ساتھ اس کے ربط کے ایک صاف گو اور برجستہ ناقد کے حوالے سے بھی شہرت رکھتا ہے۔ اپنے رفیق کار، مرحوم ایڈ ہرمین، کے ساتھ مل کر چومسکی نے بڑے کاروباری اداروں کے زیر اثر عوامی ذرائع ابلاغ کا ایک ''تشہیری نمونہ'' اجاگر کر دکھایا تا کہ معاشی اور سیاسی اثر ورسوخ رکھنے والے ایک چھوٹے سے طبقے کی طرف سے نظریاتی جواز برقرار رکھنے کی صلاحیت کی وضاحت کی

جا سکے۔ چھان پھٹک کے بہت سے مراحل (Filters)، یعنی کاروباری اداروں کی ملکیت، اشتہاروں پر انحصار، مقتدر حلقوں کے موافق ذرائع سے خبریں بھیجنا/ وصول کرنا، دائیں بازو کے ناقدیں اور نظریاتی کمیونزم۔ مخالف حلقوں کی طرف سے شدید تنقید وغیرہ، خبریں نشر کرنے والے ذرائع کو ایک ایسے تشہیر نظام کے طور پر کام کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں جو اشرافیہ کی طاقت کو استحکام عطا کرے۔

حالیہ برسوں میں، چومسکی نے اپنے غیر معمولی ذہن کا رُخ بقا کو خطرے میں ڈالنے والی عالمی حِدّت کی طرف کر دیا ہے، ''منظم انسانی زندگی کے تسلسل کو لاحق خطرہ'' جو کہ ایٹمی جنگ کے خطرے سے کم نہیں ہے۔ اپنے ایک ایسے انٹرویو میں جو کہ 22 جنوری کو صرف اور صرف ''نیشنل آبزور'' کو دیا گیا تھا، چومسکی نے ذرائع ابلاغ اور موسمیاتی تبدیلی کے درمیان مخصوص قسم کے تعلق کو براہ راست موضوع بتایا ہے۔

نیشنل آبزور: حالیہ برسوں میں، آپ نے ماحولیاتی یا موسمیاتی بحران کی شدت کے حوالے سے بہت کچھ کیا ہے، اور آپ نے اس حوالے سے بھی بہت سی مثالیں پیش کی ہیں کہ تجارتی بنیادوں پر کام کرنے والے ذرائع ابلاغ اس کی گہرائی/ وسعت سے کس قدر بے خبر ہیں۔ آپ اس بحران کے حوالے سے تجارتی ذرائع ابلاغ کے عمومی کردار کی کس طرح تشخیص کریں گے؟ کیا چھان پھٹک کے وہ مراحل (Filters) جو آپ اور ایڈ ہرمین کی طرف سے ذرائع ابلاغ کے اجاگر کردہ تشہیری نمونے'' میں عیاں کئے گئے تھے، عالمی حدت کے حوالے سے تجارتی ذرائع ابلاغ کی خامیوں کی وضاحت میں مدد دیتے ہیں، یا کیا دیگر ایسے عوامل بھی ہیں جو عالمی حدت کو بڑھا کر رکھ دیتے ہیں؟

نوم چومسکی: ایک معیاری قسم کے اخباری مضمون کو دیکھتے ہیں۔ اس طرح کی خبریں آ رہی ہیں کہ کیا ہو رہا ہے۔ تو اگر آپ آج کے ''نیویارک ٹائمز'' پر نظر ڈالیں، مثال کے طور پر، آپ کو قطبی برفانی چوٹیوں کے پگھلنے کے حوالے سے نئی دریافتوں پر ایک بہت عمدہ مضمون مل جائے گا، پگھلنے کے اس عمل کے حوالے سے جو، حسبِ معمول، زیادہ شدّت کا حامل نظر آتا ہے بہ نسبت (پہلے سے) لگائے گئے تخمینوں کے؛ طویل عرصے سے یہی رواج چلا آ رہا ہے۔ اور اس (مضمون)

www.MashalBooks.org

میں سطح سمندر میں اضافے کے ممکنہ اثرات کو بھی زیر بحث لایا گیا ہے، اگرچہ بہت محتاط انداز میں، باوجود اس کے کہ یہ ڈرامائی طور پر واضح (صورتحال) ہے۔ چنانچہ اس موضوع پر باقاعدگی سے لکھا جارہا ہے، اور ایسا نہیں کہ عالمی حدّت کے مسئلے کو نظرانداز کیا جارہا ہو۔ دوسری طرف، آپ اگر تیل کی تلاش کے حوالے سے کسی معیاری مضمون پر نظر ڈالنا چاہیں تو نیو یارک ٹائمز میں آپ کو اس موضوع پر سرورق کا بہت بڑا مضمون مل جائے گا کہ امریکہ کس طرح اس سمت پیش رفت کررہا ہے کہ جسے توانائی کے شعبے میں خودانحصاری کہا جاتا ہے، زیر زمین ایندھن کی پیداوار میں سعودی عرب اور روس کو بھی پیچھے چھوڑتے، نئے علاقوں میں کھوج کی سرگرمیوں کا آغاز کرتے ہوئے، جیسے وائیومنگ، مڈویسٹ وغیرہ۔ یہ بہت طویل مضمون ہوتا ہے، ہوسکتا ہے کہ ایک ہزار الفاظ پر مُشتمل۔ میرے ذہن ایک خاص مثال ہے، اس میں ماحول پر اثرات کا ذکر ہوگا، مقامی آبی وسائل پر، مویشیوں کی پرورش کرنے والوں کے لئے، نقصان دہ اثرات کا، مگر عالمی حدّت پر اثرات کے حوالے سے ایک لفظ بھی نہیں ہوگا۔ اور یہی صورتحال ایک کے بعد ایک مضمون میں ہوتی ہے، ہر جریدے میں، ''دافنانشل ٹائمز''، ''دانیو یارک ٹائمز''، تمام بڑے اخبارات میں۔ تو ایسا لگتا ہے کہ ایک طرف تو تنگ نظری سی ہے، سائنسی خبریں دینے والے اکثر یہ کہہ رہے ہوتے ہیں، ''دیکھو یہ تباہی ہے،'' مگر پھر عمومی خبروں میں اس پہلو کو بس نظرانداز کرکے رکھ دیا جاتا ہے، اور کہا جاتا ہے، ''ٹھیک ہے، کیا یہ زبردست بات نہیں ہے کہ ہمیں تیل درآمد نہیں کرنا پڑے گا، ہم زیادہ طاقتور ہوجائیں گے، وغیرہ وغیرہ۔

یہ ایک طرح سے شیزوفرینیا ہے، اور پورا معاشرہ اس مرض میں مبتلا ہوچکا ہے۔ بڑے بڑے بینکوں کی مثال لے لیں، جیسے جے۔ پی مورگن چیز۔ یہ سب سے بڑا بینک ہے اور سی ای او جیمی ڈائمن ایک ذہین شخص ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اسے عالمی حدّت کے شدید خطرے کے حوالے سے بنیادی حقائق کا علم ہے، اس کے باوجود وہ لوگ زیر زمین ایندھن نکالنے کے منصوبوں میں سرمایہ کاری کیے جارہے ہیں، کیونکہ یہ کاروباری نمونہ ہے۔ اُنہوں نے کل کو منافع بھی کمانا ہے۔

تو، کیا تجارتی بنیادوں پر قائم ذرائع ابلاغ کا بحیثیت مجموعی یہی کردار ہے کہ وہ کڑیاں ملانے میں ناکام ہورہے ہیں؟

یقیناً، میں آزاد خیال ذرائع ابلاغ کی بات کررہا ہوں۔ اگر آپ فوکس نیوز کی بات کرنے لگے ہیں تو یہ بہت مختلف معاملہ ہے: عالمی حدّت کا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ اور، دراصل، رائے عامہ میں یہی کچھ ظاہر ہوتا ہے۔ تقریباً نصف ری پبلیکنز اس امر کی سیدھی سادی تردید کرتے ہیں کہ عالمی حدّت کا عمل ہورہا ہے۔ اور جہاں تک باقی نصف کا تعلق ہے تو ان میں سے تھوڑی سی اکثریت ہی سمجھتی ہے کہ انسان اس عمل میں ملوّث ہوسکتے ہیں۔ آپ اس حوالے سے ہونے والی ان سماعتوں کو ہی لے لیں، جو کوئی دو دن پہلے، ای پی اے (انوائرنمنٹل پروٹیکشن ایجنسی) کے نئے سربراہ کے لئے ہوئی تھیں جس کا کوئلے کی صنعت کا تجربہ تھا۔ ایک سینیٹر نے اس سے پوچھا کہ آپ کا عالمی حدّت کے بارے میں کیا خیال ہے؟ اس نے جواب میں کہا، ''ہاں یہ عمل غالباً اپنی جگہ پر ہورہا ہے، اس میں غالباً انسان ملوّث ہیں۔'' اور پھر اس سے سوال کیا گیا کہ، ''آپ کے خیال میں اس کی نوعیت کتنی ہنگامی/توجہ طلب ہے؟'' اور اس کا جواب یہ تھا کہ ''توجہ طلب ہونے کے حوالے سے اس کا درجہ غالبا آٹھواں یا نواں بنتا ہے، تو یہ ایسی حقیقت ہے کہ جس سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔'' اور حال یہ ہے کہ اس حوالے سے کچھ بھی نہیں کیا جارہا۔

خود ذرائع ابلاغ کے معاملے میں کیا چھان پھٹک کے وہ مراحل (Filters) جو آپ نے تشہیری نمونے (Propaganda Model) میں شناخت کئے ہیں، ان کی خامیوں کی وضاحت کرتے ہیں، یا کیا دیگر عوامل بھی فعّال ہیں؟

جی ہاں، تاہم یہ تقریباً واضح ہے۔ یہ بڑی سطح کے اس کاروباری نمونے کے اہم اجزا ہیں جو کچھ یوں ہے: آپ نے کل کو منافع بھی کمانا ہے۔ اور معاشرے نے بھی پنپنا ہے۔ وہ اس امر کی پرواہ نہیں کرتے؟ کس طرح کی افزائش ہونی چاہیے، بس افزائش ہونی چاہیے۔ اور یہ ایک طرح سے جزو لازم ہے۔ تو، جی ہاں، تشہیری اداروں کا اثر ہوتا ہے، اور یہ حقیقت کہ یہ کارپوریشن (بڑی سطح کی اجماعیت) ہوتے ہیں اپنا اثر رکھتی ہے۔ تاہم، اس سے بھی گہرا نکتہ جس کا، میرے خیال میں،

مکمل طور پر ادراک نہیں کیا جاتا (اور جسے ہم نے اپنی ''مینوفیکچرنگ کونسنٹ'' نامی کتاب میں بھی دراصل موضوع بحث نہیں بنایا)۔ مجھے اس چیز کا علم نہیں ہے کہ آیا آپ نے کبھی ''اینمیل فارم'' کا تعارف پڑھا ہے، غالباً نہیں پڑھا، کیونکہ اس کو عیاں نہیں ہونے دیا گیا، تاہم یہ بعدازاں اس وقت عیاں ہو کر رہ گیا جب یہ کوئی 30 برس بعد اس کی دستاویزات میں ملا، اور یہ ایک دلچسپ قسم کا تعارف ہے۔ اس کتاب کا مخاطب برطانیہ کے عوام ہیں اور وہ کہتا ہے کہ یہ کتاب، بلاشبہ، ایک آمریت پسند دشمن پر طنز (Satire) ہے۔ تاہم وہ یہ بھی کہتا ہے کہ ہمیں اس کے حوالے سے خود کو اتنا پارسا نہیں سمجھنا چاہیے، اور میں اب اس کے الفاظ دہرا رہا ہوں، ''آزاد انگلستان میں نظریات کو کسی طاقت کے بغیر دبا کر رکھا جاسکتا ہے۔''

نوم چومسکی: ''دونسلوں کے بعد امکان ہے کہ منظم انسانی معاشرے کا وجود نہ رہے۔ اسے مسلسل لوگوں کے دماغوں میں ڈالنے کی ضرورت ہے۔''

آرول چند ایک مثالوں کے ساتھ ہی وضاحت کے لئے دو جملے بھی پیش کرتا ہے۔ ایک تو یہ ہے صحافت دولت مند لوگوں کی باندی ہے جن کا مفاد ہر لحاظ سے یہ ہے کہ بعض نظریات کسی طرح بھی لوگوں پر عیاں نہیں ہونے چاہئیں، تاہم دوسرا (جملہ) محض ایک ناگزیر طور پر اچھی تعلیم کے بارے میں ہے۔ آپ بہترین اسکولوں میں جاتے ہیں، آکسفورڈ اور کیمبرج سے تعلیم حاصل کرتے ہیں، اور آپ کے اندر ایک ایسا فہم سرایت کر دیا گیا ہے کہ بعض معاملات ایسے ہوتے ہیں کہ ان پر نہ بولنا ہی مناسب رہتا ہے، اور آپ ان کے بارے میں سوچنا بھی چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ وہی کچھ بن جاتا ہے جسے کہ گرامچی نے ''مسلط کردہ عقل تسلیم'' کا نام دیا ہے۔'' آپ اس کے بارے میں سوچتے ہی نہیں ہیں۔ اور یہ ایک بہت بڑا عنصر ہے، کہ یہ چیزیں کس طرح آپ کے اندر داخل کر دی جاتی ہیں۔ جو لوگ ان چیزوں کو عیاں کرتے ہیں وہ دیوانے نظر آتے ہیں۔

صحافت کا متبادل کیا ہوسکتا ہے؟ یہ موسمیاتی تبدیلی کے حوالے سے کس طرح مختلف کردار ادا کرسکتا ہے؟

ہر ایک جریدے میں روزانہ اس طرح کی چیختی چنگھاڑتی شہ سرخی لگانی چاہیے جو پکار پکار کر کہہ رہی ہو کہ ہم مکمل تباہی کی طرف گامزن ہیں۔ دونسلوں کے بعد منظم انسانی معاشرہ ناپید ہو کر رہ سکتا ہے۔ اس حقیقت کو مسلسل لوگوں کے ذہنوں میں ڈالنے کی ضرورت ہے۔ آخر کو تاریخ انسانی اس طرح کی صورتحال کی پہلے کوئی مثال نہیں ملتی۔ موجودہ نسل کو یہ فیصلہ کرنا پڑے گا کہ آیا ایک منظم انسانی زندگی دونسلوں کے بعد باقی رہے گی، اور یہ فیصلہ تیزی سے کرنا ہوگا، کیونکہ وقت بہت کم رہ گیا ہے۔ چنانچہ اب ٹال مٹول سے کام لینے اور آئیں بائیں شائیں کرنے کے لئے کوئی وقت نہیں رہا۔ اور پیرس مذاکرات سے الگ ہو جانے کو تاریخ کا ایک بدترین جرم قرار دے دینا چاہیے۔

تاہم کیا خطرہ نہیں ہے کہ لوگوں کو صرف بُری خبریں سنا کر ان کو بے بسی کے عالم میں دھکیل دیا جائے؟

ہاں، ایسا ہے۔ تاہم بری خبر کے ساتھ ہی ایسے امکانات پر بھی مباحثہ کروانا چاہیے کہ کیا ہوسکتا ہے اور کیا کیا جا رہا ہے۔ مثال کے طور پر ایک بہت ہی اچھے معیشت دان، ڈین بیکر کا کوئی دو ہفتے قبل ایک کالم تھا جس میں چین میں ہونے والی سرگرمیوں کو موضوع بحث بنایا گیا تھا۔ وہ ابھی بھی بہت زیادہ آلودگی پھیلا رہے ہیں، تاہم وہ قابل تجدید توانائی کے نظام کی طرف منتقلی کے اتنے بڑے بڑے منصوبے بنا رہے ہیں کہ دنیا میں ان کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ ریاستیں اس طرح کام کر بھی رہی ہیں یا نہیں بھی۔ یہاں ایریزونا کی مثال لیتے ہیں، آپ یہاں گھوم پھر کر دیکھیں، سورج ہر وقت چمک رہا ہوتا ہے، سال کے اکثر حصّوں میں؛ ایک نظر ڈالیں اور خود ہی بتائیں کہ یہاں آپ کو شمسی توانائی جذب کرنے والی کتنی تنصیبات نظر آتی ہیں۔ مضافاتی علاقوں میں صرف ہمارا گھر ہی ایسا ہے جہاں یہ قریب لگے ہوئے ہیں۔ لوگوں کو شکایت ہے کہ انہیں گرمیوں میں ٹھنڈک کے لئے ہر ماہ ہزاروں ڈالر بجلی کا بل ادا کرنے کے لئے صرف کرنے پڑتے ہیں لیکن وہ شمسی

www.MashalBooks.org

توانائی جذب کرنے والا نظام نصب نہیں کرائیں گے؛ اور حقیقت تو یہ ہے کہ ''ٹسکان الیکٹرک کمپنی ایسا کرنا اور بھی مشکل بنا دیتی ہے۔ مثال کے طور پر، ہمارے شمسی توانائی کے نصب کردہ تختوں میں سے کچھ تختے غائب ہیں کیونکہ آپ کو بہت زیادہ بجلی پیدا کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

یہ ہماری بدقسمتی ہے۔ آپ کو اس طرح کی صحافت کہاں ملے گی جو ہنگامی صورتحال کا احساس دلانے کے ساتھ ہی مطلوبہ اقدامات کا فہم بھی اجاگر کرے؟

بہت خوب، یہ آپ کو چھوٹے پیمانے پر شائع ہونے والے جرائد میں ملے گی۔ اصل نکتہ یہ ہے کہ عالمی حدّت کے مسئلے کو اجاگر کرنا چاہیے۔ آپ کی بات درست ہے کہ ہر وقت بُری خبریں نہیں سنائی جاسکتیں؛ لوگ مُنہ موڑ لیتے ہیں۔ تاہم اگر آپ بُری خبروں کے ساتھ ہی ایسی مُثبت تجاویز بھی پیش کریں جن پر عمل کیا جانا چاہیے، اور اُن کی ہنگامی نوعیت سے بھی لوگوں کو آگاہ کریں تو پھر میرے خیال میں اس کے اچھے اثرات رونما ہوں گے۔

کیا ایسا زیادہ تر متبادل طور پر موجود آزاد ذرائع ابلاغ میں ہی ہوتا ہے جہاں آپ کو موسمیاتی بحران کے موضوع کا احاطہ موسمیاتی بحران کے طور پر ہی کیا جاتا نظر آتا ہے؟

آپ کو یہ سب کچھ متبادل ذرائع ابلاغ میں ہی مل جاتا ہے، مگر یہ زیادہ لوگوں تک نہیں پہنچ پاتا۔ اور صرف اس بحران کا ہی نہیں، دیگر بحرانوں کا احاطہ بھی کیا جاتا ہے۔ موازنے کے لئے ایک مثال ایٹمی جنگ کی ہے۔ 24 جنوری کو، یہ ایک مناسب تجویز ہوگی کہ ایٹمی سائنسدانوں کے خبرنامے پر نظر ڈالی جائے، یہ وہ دن ہے جس دن وہ مفروضہ طور پر یوم حشر کی گھڑی پر نئے وقت کا تعین کریں گے۔ آدھی رات میں پہلے ہی بمشکل دو منٹ رہ گئے ہیں؛ مجھے نہیں معلوم کہ ان کا اگلا قدم کیا ہوگا، ہوسکتا ہے کہ وہ آدھی رات کے بعد وقت کا اعلان کردیں! بنیادی مسائل صرف دو ہیں، ایٹمی جنگ اور عالمی حدّت، اور دونوں ہی مسلسل خطرناک تر صورتحال اختیار کرتے جارہے ہیں۔ تاہم ابھی اور بھی بہت کچھ ہے۔ وبائی خطرے کی مثال ہی لے لیں۔ صنعتی سطح پر گوشت کی پیداوار، سب سے پہلے تو ایک غیر انسانی عمل ہے، تاہم، دوسری بات یہ ہے کہ عالمی حدّت

میں اضافے کے حوالے سے اہم کردار ادا کررہی ہے؛ اور یہ جراثیم کش دواؤں کی افادیت بھی ختم کررہی ہے۔ یہ لوگ جراثیم کش دواؤں کا بہت زیادہ استعمال کررہے ہیں، اور اس طریقے سے بیکٹیریا کی ایسی (Mutant) شکلیں سامنے آرہی ہیں جو کسی بھی قسم کی جراثیم کُش دواؤں کی مزاحمت کرسکتی ہیں، اور ہسپتالوں میں ان کی موجودگی کے نتیجے میں بڑے پیمانے پر وبائیں پھوٹ سکتی ہیں۔ اس کی ایک مثال زُکام کی وہ وبا ہے جو ایک صدی قبل آئی تھی جس کے نتیجے میں لاکھوں کروڑوں لوگ مرگئے تھے۔ لوگ نقل مکانی کے بحران کی بات کرتے ہیں، اس وقت کیسا لگے گا جب بنگلہ دیش میں سیلاب آجائیں گے، لاکھوں کروڑوں لوگوں کو راہِ فرار اختیار کرنی پڑے گی؟ جنوبی ایشیا میں پانی کی قلت ہوتی جارہی ہے، وہاں کروڑوں لوگ پہلے ہی پانی کی شدید قلت کا شکار ہیں؛ برفانی قطعات کے پگھلنے اور اسی طرح کی دیگر تبدیلیوں کی بدولت ان کو دستیاب پانی سے محروم ہونا پڑسکتا ہے۔

ایسی صورت میں دنیا کا کیا ہوگا؟ یہ بہت وسیع پیمانے کے مسائل کی زد میں آجائے گی۔ اور وہ وقت دور نہیں ہے۔

کیا اس وقت کے مخصوص ذرائع ابلاغ کی نمائندگیاں موجود ہیں، متبادل یا آزاد قسم کے یا کوئی اور، جہاں سے آپ کو خود اپنے لئے معلومات ملتی ہوں؟

میں نمایاں قسم کے رسائل و جرائد کا مطالعہ کرتا ہوں، تاہم اصل میں یہ سائنسی جرائد ہی ہیں جو آپ کو تازہ ترین صورتحال سے باخبر رکھتے ہیں۔ بلاشبہ، ان میں ایسا تکنیکی قسم کا مواد ہوتا ہے جو آپ عام طور پر نہیں پڑھتے، تاہم وہ اس حوالے سے واشنگٹن پوسٹ، دانیویارک ٹائمز، اور بلاشُبہ ڈگر سے ہٹے ہوئے دیگر جرائد کو بھی اس طرح کی اچھی رپورٹیں فراہم کرتے ہیں۔

آپ کا کیا خیال ہے کہ امریکہ میں یا دیگر مفروضہ جمہوری معاشروں میں ایسا ممکن ہے کہ ذرائع ابلاغ میں اس طرح کی اصلاحات کی جائیں جن کے نتیجے میں زندگی کے وجود یا بقا کے مسئلے کو اجاگر کرنے والی صحافت کے لئے بہتر گنجائش پیدا ہوجائے؟

اس کے لئے ایک طریقہ تو یہ ہوگا کہ ان معاشروں میں جمہوریت رائج ہوجائے۔ یہ اس سے بہت دور ہیں۔ انتخابات کو ہی لے لیں، مروجہ سیاسی علوم میں اس حوالے سے بہت ہی اطمینان بخش کام مل جائے گا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ امریکہ میں انتخابات بنیادی طور پر خرید لئے جاتے ہیں۔ آپ کانگرس/ مقننہ اور انتظامیہ کے لئے ہونے والے انتخاب کا نتیجہ حیرت انگیز درستی کے ساتھ پہلے سے ہی بتا سکتے ہیں جس کے لئے آپ نے صرف یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ مُہم پر کتنے اخراجات آئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب کوئی ایوان نمائندگان کے لئے منتخب ہوتا ہے تو عہدہ سنبھالنے کے پہلے دن ہی اسے اگلے انتخابات کے لئے عطیات دینے والوں کی حمایت حاصل کرنے کا عمل شروع کرنا پڑتا ہے۔ اس دوران قوانین تحریر کرنے والے عملے کے ارکان کے ساتھ ایسے لوگ بھی موجود رہتے ہیں جو بڑے کاروباری اداروں یا کارپوریشنوں کے لئے مہم چلا رہے ہوتے ہیں، جو دراصل اکثر اوقات خود ہی قوانین تحریر کر رہے ہوتے ہیں۔ یہ ہے جمہوریت جو کہ بہت ہی محدود قسم کی ہے۔

کیا آپ کو وسیع تر سماجی اور سیاسی تبدیلیوں کے علاوہ ذرائع ابلاغ میں اصلاح کا کوئی امکان نظر آتا ہے؟ کیونکہ اس طرح کی ایک تحریک، جیسا کہ آپ کو معلوم ہے، خاص طور پر ذرائع ابلاغ میں اصلاح کے لئے رابرٹ میکسنے اور بہت سے اور لوگوں کی طرف سے چلائی جارہی ہے۔

اس حوالے سے بہت کچھ ہے جو کیا جاسکتا ہے۔ نظام کے اندر کئی طرح سے بامعنی تبدیلیاں لانے کی ضرورت ہے، حتیٰ کہ بنیادی قسم کی تبدیلیاں بھی۔ ذرائع ابلاغ کی اصلاح ان میں سے ایک ہے۔ باب میکسنے کی اہم تحقیق ایک مثال ہے۔ ایسی چیزیں ہیں جو کی جاسکتی ہیں۔ بڑے پیمانے پر مروجہ ذرائع ابلاغ کی بڑھتی ہوئی اجارہ داری ایک سنجیدہ قسم کا مسئلہ ہے، جیسا کہ آپ کو بخوبی معلوم ہوگا، تاہم اگر آپ بن بگڈیکیئن کی اس کتاب پر نظر ڈالیں جو 1980 کے قریب ذرائع ابلاغ کی اجارہ داری پر لکھی گئی تھی تو اس وقت خبروں کے 50 کے قریب ماخذ ہوتے تھے جو کہ کم ہوکر نصف درجن رہ گئے ہیں۔ ذرائع ابلاغ کا اشتہاروں کے ذریعے منافع کمانے کے رجحان نے صحافت کو کھوکھلا کر کے رکھ دیا ہے۔ آپ ذرا شروع کے دِنوں کی طرف جائیں، حتیٰ کہ امریکہ

میں بھی حکومت کو ایک آزاد و خودمختار اخبارات کی اہمیت کا اندازہ تھا، اور اس طرح کی سادہ رعایتوں کا بھی، جیسے ڈاک کی مفت شرحیں، جو کہ ایک آزاد صحافت کو منظر عام پر لانے کی تدبیریں تھیں۔ میں نے ابھی حال ہی میں ایک بڑی دِلچسپ کتاب پڑھی ہے، مائیکل کلارمین کی ''دافریمرز کُو''۔ یہ اب آئین کی تشکیل کے حوالے سے طلائی معیار کی حیثیت رکھتی ہے؛ اس میں اس وقت جاری مباحثوں کے حوالے سے بہت زیادہ تفصیلات دی گئی ہیں جو کہ کافی حد تک متاثر کُن ہیں۔ کتابچوں کی شکل میں مطبوعات، آزاد صحافت کی شکل میں مطبوعات وغیرہ عام تھیں، لوگ بھی اشاعت کے لئے مواد بھجواتے تھے اور کاشتکار و دستکار و ہر خاص و عام اپنے حصّے کا مواد بھجوادیتا، مباحثے کے انداز میں۔ انیسویں صدی کے وسط میں، پیچھے مڑ کر دیکھیں تو اس وقت محنت کشوں اور ثقافتی حلقوں کے لئے ایک بہت جاندار قسم کی صحافت رائج تھی جو کہ بہت ہی دلچسپ سرگرمیاں کر رہی تھی۔ تاہم یہ سب کچھ سرمائے کے ارتکاز اور اشتہاری نمونے کی تشکیل کی بدولت ختم ہو کر رہ گیا، اور بالکل یہی کچھ برطانیہ میں ہوا، اگرچہ برطانیہ میں پرانی صحافت ذرا طویل عرصہ تک برقرار رہی، یعنی 1960 کی دہائی تک۔

کیا آپ کو انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا پر ایک متبادل صورتحال پیدا ہونے کی خاطر خواہ اُمید ہے؟

ایک اُمید نظر آتی ہے، تاہم سوشل میڈیا بہت حد تک دودھاری تلوار کے طور پر فعال ہوتا رہا ہے۔ یہ واضح طور پر ایک طرح کا مخصوص عقائد کے پرچار کا محدود قسم کا نظام (Echo chamber) ہے، بلبلے کی طرح۔ ہم سب یہ کام کرتے ہیں، لوگ اس طرح کھنچتے چلے جاتے ہیں جس طرح ان کا یقین ہوتا ہے اور دوسرا نقطہ نظر نہیں سُنتے، صرف آپ کے نقطہ نظر کو ہی ربط باہمی یا تبادلہ خیال کو ناممکن بنانے کی صورت میں نکل رہا ہے۔ یہ کسی حد تک بہت وحشت ناک ہے۔ میں حال ہی میں چند ایک اعداد و شمار کا جائزہ لے رہا تھا تو پتہ چلا کہ حال ہی میں لئے جانے والے بعض جائزوں کے مطابق ان امریکیوں کی تعداد، جو کہ بڑے پیمانے کے ذرائع ابلاغ کو معلومات کے اہم ماخذ کے طور پر استعمال کرتے ہیں، یک ہندسی ہے، یعنی کوئی چھ فیصد کے قریب۔ ان میں سے اکثر سوشل میڈیا کی طرف جارہے ہیں جو کہ کسی طرح کی خبروں کا ماخذ نہیں ہوتا، وہ اس میں سے چن کر

www.MashalBooks.org

الگ کر لیتے ہیں، اوران کے پاس باہر سے جا کر خبریں لانے کے لئے کوئی رپورٹر نہیں ہوتے۔

اور پھر، بلاشُبہ، آپ کے پاس اس طرح کی اختراعات بھی ہیں، جیسے ریڈیو مذاکرہ (Talk Radio) اور فوکس (Fox)، جو کہ نئے تصورات ہیں۔ یہ محض کینہ سے بھر پور تشہیری ہتھکنڈے ہیں، جو بمشکل کچھ اور نظر آنے کی کوشش کرتے ہیں۔

یہ ہے تاریک پہلو۔ مُثبت رُخ یہ ہے کہ (یہ سوشل میڈیا) ایسا طریقہ ہے جس سے کہ منظم ہونے کا عمل جاری رہتا ہے۔ یہ وہ طریقہ ہے جس کی بدولت آپ کی لوگوں تک رسائی ہوتی ہے، آپ یکجا ہوتے ہیں، اور یہ ایک بہت ہی موثر وسیلہ ہے۔ عملی طور پر ہر طرح کی تنظیم اسی طرح سے ہوتی ہے۔ میرا مطلب ہے کہ اساتذہ بھی اسی طرح تنظیمی عمل کرتے ہیں، وہ اکثر سوشل میڈیا کی وساطت سے ہی طلبا سے رابطہ رکھتے ہیں۔ یہی وہ سب کچھ ہے جو باقی لوگ بھی کر رہے ہیں۔ اگر آپ کیمپس کا چکر لگا کر دیکھیں تو ہر کوئی کسی نہ کسی شکل میں انٹرنیٹ پر مصروف ملے گا۔ ایک یونیورسٹی نے، میرے خیال میں ڈیوک یونیورسٹی نے، پیدل چلنے والوں کے راستے پر اس طرح کے پیغامات نصب کرنے شروع کر دیئے، مثلاً اوپر دیکھیں! کیونکہ سب لوگ چلتے ہوئے نیچے دیکھ رہے ہوتے ہیں۔

یقیناً، اثرات کا تعین کرنا بہت مُشکل ہوتا ہے۔ آپ میکڈونلڈ میں نوبالغ بچوں کو دیکھتے ہیں، کیا کہتے ہیں، میزوں کے گرد بیٹھے ہوئے اور وہاں دو قسم کی گفتگو جاری ہوتی ہے۔ ایک تو اجتماعی قسم کی جو لوگ آپس میں کر رہے ہوتے ہیں اور دوسری وہ جو کہ ہر آدمی فون پر کر رہا ہوتا ہے، کسی سے بھی۔ اس طرح سے بامعنی سماجی رشتے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو کر رہ جاتے ہیں۔

یہ شاید ایک امکانی وسیلہ بھی ہو سکتا تھا، کم سے کم، متبادل ذرائع ابلاغ کا انٹرنیٹ کو موسمیاتی تبدیلی کے حوالے سے تبادلہ خیال کے لئے بروئے کار لانا۔

بلاگز، ٹرتھ آؤٹ، ٹرتھ ڈِگ، کامن ڈریمز، ڈیماکریسی ناؤ (Democracy Now)، اور بہت سے اور ہر طرح کی ایسی معلومات عیاں کر رہے ہیں جو آپ کو ٹیلی وژن پر نہیں مل سکتی۔

تو یہ امکانی طور پر غیر معمولی افادیت کا حامل وسیلہ ہے، تاہم یہ اس کا منفی پہلو ہے جس پر سلیکون

ویلی کے کرتا دھرتا تشہیری نمونے کی طرز پر سخت زور دے رہے ہیں، تو اسے آپ پر مسلسل مُسلط کیا جا رہا ہے۔ آپ گوگل پر کسی شے کی کھوج لگاتے ہیں اور آپ پر ایسی چیزوں کی یلغار کر دی جاتی ہے جو آپ کو مفروضہ طور پر درکار ہوتی ہیں، اور یہ بڑے بڑے تشہیر کنندگان کی بدولت پڑنے والے اثرات ہیں۔

موسمیاتی تبدیلی کا موثر حل نکالنے کے قابل ہونے کے لئے کس طرح کے لوازمات یا حالات کی ضرورت ہے؟

میرے خیال میں اس کے لئے ایک بھر پور قسم کی مقبول عوامی تحریک کی ضرورت ہے جو ذرائع ابلاغ کو ان بحرانوں کی طرف توجہ مرکوز کرنے پر مجبور کرے گی جن کا ہمیں مسلسل دباؤ کی بدولت سامنا ہے۔ یا پھر ایسے متبادل تخلیق کرنے پڑیں گے جو معلومات کی منڈی پر غالب آ جائیں۔ اور ہمارے پاس ضائع کرنے کے لئے وقت نہیں ہے۔ چنانچہ اس طرح کے کام کرنے کی ضرورت ہے، جیسے آزاد ذرائع ابلاغ کو رعایتیں فراہم کرنا جو کہ کوئی خیالی قسم کی چیز نہیں ہے۔ ایسا امریکہ میں بھی شروع شروع میں کیا گیا تھا؛ یا پھر ذرائع ابلاغ کی ایک طرح کی وسیع پیمانے کی تحریکیں، جیسی، کیا کہتے ہیں، باب میکسنے اور دیگر فروغ دینے کے لئے دباؤ ڈال رہے ہیں۔

اور یہ ایک فوری ضرورت ہے۔ میں گذشتہ دو برسوں سے کمرہ جماعت میں اپنی سرگرمیوں کا آغاز طلباء سے یہ کہہ کر کرتا چلا آ رہا ہوں کہ انہیں ایک ایسی صورتحال کا انتخاب کرنا پڑے گا کہ انسانی تاریخ میں کسی نے نہیں کیا ہوگا۔ انہیں یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ آیا انسانی معاشرے کی بقا کا عمل جاری رہے گا یا نہیں۔ حتیٰ کہ یہ سوال اس وقت بھی سامنے نہیں آیا تھا جب نازی غارتگری میں مشغول تھے مگر اب ہمیں اس کا سامنا کرنا ہوگا۔

ذرائع ابلاغ سے ماورا ہو کر دیکھیں تو کیا دیگر ایسی عمومی شرائط ہیں جن کا پورا کرنا موسمیاتی بحران سے نکلنے کے لئے ضروری ہو؟

بہت سی ایسی تنظیمیں (Groups) ہیں جو بڑے پیمانے کی سرگرمیاں مُنظم کروا رہی ہیں، جیسے ''ارتھ

www.MashalBooks.org

سٹرائیک'' جوکہ سرگرمیوں کا ایک سلسلہ مرتب کررہی ہے؛ انہوں نے مختلف شہروں میں مظاہرے کروانے میں بھی پہل کی تھی، ایک عوامی سطح کی عمومی تحریک کی بنیاد رکھنے کے لئے۔ برطانیہ سے ''ایکسٹنکشن ریبلیین'' یہاں منتقل ہوگئی ہے، اسی طرح کی کاوش کرتے ہوئے۔ تاہم یہ ڈرامائی سرگرمیاں، عمومی مظاہروں کی طرح موثر ثابت نہیں ہوں گی اگر ان کا شمار الگ تھلگ قسم کے واقعات میں ہوگا۔ انہیں تسلسل سے ایسی تنظیم وتعلیم کا محرک بننا پڑے گا جوکہ روزانہ کی بنیاد پر جاری رہے۔

اورایک مرتبہ پھران چیزوں کو پیش نظر رکھیں جن کے بارے میں ہم پہلے بھی بات کر چکے ہیں، ٹسکون، شمسی توانائی کی تنصیبات۔ لوگوں کو اس امر کا شعور حاصل کرنا ہوگا کہ ایسا کرنا ناگزیر ہو چکا ہے، اور تیزی سے؛ اور انہیں اس کا کوئی نقصان نہیں ہوگا، بلکہ ان کی زندگیوں میں بہتری آئے گی۔ مثال کے طور پر، اس سے حتیٰ کہ پیسوں کی بچت بھی ہوتی ہے۔ تاہم، ایک نفسیاتی رکاوٹ ہوتی ہے جو کہتی ہے کہ میں اسے نہیں دیکھ سکتا/سکتی، اور میں صرف عام عقائد تک ہی محدود رہنا چاہوں گا جبکہ یہ کسی حد تک ایک نئی چیز ہے جس سے ہمیں خطرہ محسوس ہونا چاہیے۔ یہ ایک ایسی رکاوٹ ہے جس پر مسلسل تعلیمی سطح پر تنظیم کی سرگرمی کی بدولت قابو پایا جاسکتا ہے۔ ہر مقبول عام تحریک اسی طریقے سے پروان چڑھی، شہری حقوق کی تحریک، جنگ مخالف تحریک، حقوق نسواں کی تحریک، محض تسلسل کے ساتھ، اکثر چھوٹی چھوٹی تنظیمیں بھی پروان چڑھ کر بڑی تنظیموں کے طور پر متحرک ہوگئیں۔ کبھی کبھار انہیں اس طرح کی ڈرامائی سرگرمیاں بھی کرنی پڑتی ہیں جیسے کوئی مظاہرہ، تاہم زیادہ تر جاری سرگرمی کے لئے محرّک کے طور پر۔

اور اسے مزید تاخیر کا شکار نہیں کیا جاسکتا۔

ایڈیٹر کا نوٹ: 24 جنوری کو سائنسدانوں نے یومِ حشر کی گھڑی پر وقت آدھی رات میں دو منٹ کر دیا، انسانیت کو خبردار کرتے ہوئے کہ ''نیو ابنارمل'' کو آسان نہیں لینا چاہیے۔

ماخذ:

https://www.nationalobserver.com/2019/02/12features/noamchomsky-couple-generations-organized-human-society-may-not-survive-has-be

www.MashalBooks.org

11- نوم چومسکی کا کووڈ اور معیشت کے حوالے سے اظہار خیال

ہر ایک کو خوش آمدید۔ میرا نام لِنڈا اسولومان ووڈ ہے۔ میں کینیڈا کے ''نیشنل آبزور'' کی ایڈیٹر۔انچیف ہوں۔ شام بخیر۔ اگر آپ مشرق کی طرف سے آئے ہیں تو شام بخیر؛ اگر مغرب سے شمولیت کر رہے ہیں تو سہ پہر بخیر۔ میں آج کی شام نوم چومسکی کو مہمان کی حیثیت سے یہاں موجود پا کر بہت ہی عزت افزائی اور جوش وخروش محسوس کر رہی ہوں اور یہاں ہم سب کا یوں گھر کے افراد کی مانند یکجا ہونا بھی بہت زبردست محسوس ہو رہا ہے۔ ہمارا آج کا موضوع ہے، ''کیا ہم کووڈ-19 سے ایک نئی معیشت کی بدولت نجات پا سکتے ہیں، اور اگر ہاں تو کیسے؟

نوم: بہت خوب تو ایک معمول کی طبقاتی جنگ عین اس وقت لڑی جا رہی ہے۔ ہمارے اردگرد ایسے لوگ بھی ہیں جو بنیادی طور پر خود کو ''کائنات کا مالک'' کہتے ہیں، جو کہ پہلے سے ہی مستقبل کی معیشت کی منصوبہ بندی کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک اور طبقہ ہے، عام لوگوں کا، جو اس وقت کچھ زیادہ ہی بے حسی کا شکار ہے اگر تو یہ (بے حسی کی) صورتحال جاری رہتی ہے تو پھر پہلے منصوبے پر عمل درآمد کیا جائے گا۔ ان کا منصوبہ یہ ہے کہ معیشت کو پھر سے انہی خطوط پر استوار کیا جائے جیسی کہ یہ چالیس برس قبل نو آزاد نظریات کے دور (Neoliberal Period) میں تھی، مگر لوگوں پر زیادہ سختی سے گرفت کر کے، زیادہ جابرانہ اقدامات کر کے اور اس امر کی پہلے سے زیادہ یقین دہانی کے ساتھ کہ اس طرح کے نمونے میں کوئی مداخلت نہ ہو۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے ایسے

طریقے ہیں کہ جن کی بدولت میں ان کا احاطہ کر سکوں۔ سوال کرنے کا یہ اچھا موقع ہے، اس طرح کے سوال کہ ہم کس طرح کی دنیا میں رہنا چاہتے ہیں۔ کیا ہم ایک بالکل ہی مختلف دنیا میں رہنا چاہتے ہیں؟ کیا ہم ایک ایسی دنیا میں رہنا چاہتے ہیں جہاں کس طرح کی وبائیں نہ ہوں اور یاد رکھیں کہ اگرچہ ہم اس وقت وبا جیسی مُشکل میں گھرے ہوئے ہیں، مگر یہ بنیادی قسم کا بحران نہیں ہے، کسی طور بھی۔ ہم جلد یا بدیر اس وبا سے جان چھڑا لیں گے بہت بڑی قیمت ادا کر کے۔ تاہم قطبی برف کی چوٹیوں کے پگھلاؤ اور سطح سمندر میں اضافے جیسے مسائل سے فرار کی کوئی راہ نظر نہیں آ رہی، نہ ہی عالمی حدّت کے دیگر شدید منفی اثرات سے۔ دنیا کا اہم ترین مُلک امریکہ کسی کے ہاتھوں میں کھیل رہا ہے، یعنی ایک ایسی جماعت کے جو بحران کی شدت میں اضافہ کرنا اور اس امر کو یقینی بنانا چاہتی ہے کہ آنے والا بحران کسی بھی قسم کی منظم انسانی زندگی کے امکانات کو ختم کر کے رکھ دے۔ وہ اس امر کو بھی یقینی بنانا چاہتے ہیں کہ جس قدر شدت کا اور جس قدر جلد یہ بحران آ سکتا ہے آ جائے اور اس سمت میں ان کی کوششیں پورے زور شور سے جاری ہیں اس وقت بھی جبکہ ہم یہاں گفتگو کر رہے ہیں۔ میں اس کی بڑی آسانی سے مثالیں دے سکتا ہوں۔ اگر تو ہم چاہتے ہیں کہ ایسا ہو جائے تو پھر ہمیں چاہیے کہ سب کچھ دیکھتے رہیں مگر کوئی ردّعمل نہ کریں۔ اس حوالے سے کینیڈا الزام سے نہیں بچ سکتا۔ اس کے علاوہ بھی بہت سے مسائل ہیں۔ کیا ہم ایک ایسی دنیا چاہتے ہیں جس میں لوگ روزانہ کی بنیاد پر ہی جیتے رہیں۔ امریکہ میں ایسے لوگ روزانہ کی بنیاد پر ہی جیتے رہیں۔ امریکہ میں ایسے لوگوں کی تعداد ایک تخمینے کے مطابق آبادی کا 60 یا 70 فی صد بنتی ہے۔ اور یہ سب کچھ گذشتہ چالیس برس کی ایسی پالیسیوں کا نتیجہ ہے جنہیں عموماً نو آزاد یا جدید سرمایہ دارانہ منصوبوں کا نام دیا جا سکتا ہے۔ ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ دولت بس چند ہاتھوں میں ہی مرتکز رہے۔ اگرچہ امریکہ میں صورتحال کچھ زیادہ شدّت کی حامل نظر آتی ہے، تاہم دوسری جگہوں پر بھی کچھ زیادہ فرق نہیں ہے۔ امریکہ میں بحران سے قبل یہ تناسب 0.1 فی صد تھا نہ کہ ایک فیصد۔ 0.1 فی صد آبادی کے پاس ملکی دولت کا تقریباً 20 فی صد تھا اور تقریباً 50 فی صد کے واجبات ان کے اثاثوں سے زیادہ تھے اور یوں خالص اثاثے منفی اور حالات خراب ہونے کی

www.MashalBooks.org

صورت میں بمشکل گزارہ کر سکتے ہیں۔ یہ کوئی ضرورت نہیں ہے، یہ مخصوص قسم کی پالیسیاں ہیں مگر یہ پالیسیاں تبدیل ہوسکتی ہیں۔ دراصل یہ کوئی خیالی دنیا کی بات نہیں ہے کہ ہم ریگن، تھیچر اور باقی ایسے لوگوں کے دور سے قبل کے دور میں جا سکتے ہیں جب حالات / پالیسیاں مختلف تھیں اور یوں نتائج بھی۔ یوں مثال کے طور پر اگر آپ اس پر نگاہ ڈالیں۔ مجھے معلوم کہ آپ کو کتنی تفصیل درکار ہے، تاہم یہ ایک حقیقت ہے کہ ہم اس کے لئے ابھی سے کام شروع کر سکتے ہیں۔ تو مثال کے طور پر اگر تحریک پیدا کرنے والا ایک ایسا پروگرام ہے جو کہ ری پبلیکن کانگرس نے منظور کیا ہے، تو اس پر نظر ڈالیں۔ مثال کے طور پر ہمیں ایک ایسی چیز پر توجہ کرنی چاہیے جو کہ آج صبح واقع ہوئی اور آپ کے لئے ایک اچھی مثال ہے۔ سینیٹ میں اکثریتی رہنما، مچ میک کونیل، جو کہ واقعی رہنمائی کرنے والی شخصیت ہے، وہ ایک انتظامی مفکر ہے، حقیقی معنوں میں غیر معمولی منفی شخصیت ،جس نے منظر عام پر آکر یہ کہا تھا کہ تحریک پیدا کرنے والے پروگرام کے تحت بلو اسٹیٹس (ڈیموکریٹک اکثریت والی ریاست) کے لئے کوئی پیسہ نہیں ہے۔ نیو یارک جیسے علاقوں کے لئے جہاں سے ڈیموکریٹس کو ووٹ ملے ہیں، اور اس کی وجہ اس نے یہ بتائی تھی کہ آنے والی نسلوں کو ان ریاستوں میں کی جانے والی ایسی غلطیوں کی قیمت ادا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے جو ماضی میں کی گئی تھیں۔ غلطیاں یہ تھیں کہ انہوں نے پولیس، آگ بجھانے والے عملے، اساتذہ اور دیگر کے پنشن کے حوالے سے منصوبوں کی منظوری دی تھی، اور اگر یہاں پیسوں کو اسی طرح ضائع کیا جاتا رہا تو ہم مزید پیسے نہیں دے سکتے۔ اب ہم تحریک دینے والے پروگرام کو ذرا ایک انچ دور سے دیکھتے ہیں۔ ہم کس کو پیسے دے رہے ہیں؟ اس طرح کے اداروں، جیسے ہوابازی کی صنعتوں کو، جنہوں نے گذشتہ برس منافع سے جیبیں بھر بھر کر گذارا اور اس میں سے صارفین کو کچھ بھی نہ دیا، صنعت کی تعمیر کی بجائے حصص واپس خریدنے کے لئے تاکہ سرمایہ کاروں کو زیادہ منافع ملے اور خاص طور پر مُنتظمین اور انتظامی سربراہ کے لئے اور اس طرح انہوں نے کوئی 45 ارب ڈالر خرچ کئے۔ انہیں تحریک دینے والے پروگرام کے تحت کتنا پیسہ ملے گا؟ 50 ارب ڈالر۔ تو دوسرے لفظوں میں اگر امیر اور طاقتور اور بڑے کاروباری ادارے خود کو امیر و مالا مال کر کے پیسہ بے جا

اُڑانا چاہتے ہیں تو ہم انہیں پیسہ دے دیں گے، تاہم اگر ریاستیں اپنا پیسہ محنت کش لوگوں کو پنشن کی ادائیگی پر خرچ کرنے کی غلطی کریں، تو بدقسمتی، ہم انہیں کچھ بھی نہیں دینے لگے۔ یہ ہے انتظامیہ کی ذہنیت۔ اذیت پرستی (Sadism) کا یہ حال ہے کہ بیان کرنا مُشکل ہے اگرچہ طبقاتی تفریق اتنی واضح ہے کہ آپ کو صاف نظر آسکتی ہے۔ اب اگر آپ کو ایسی کوئی اور واضح مثال چاہیے، جو کہ توجہ کے قابل ہو تو وفاقی بجٹ کی تجاویز پر ہی نظر ڈال کر دیکھیں جو کہ ٹرمپ انتظامیہ نے 10 فروری کو پیش کی تھیں۔ دس فروری کو وبا بپھری ہوئی ہے؛ لوگ مر رہے ہیں؛ ہسپتال گنجائش سے زیادہ بھرے پڑے ہیں۔ مگر بجٹ میں تجویز دی گئی ہے کہ حکومت کے صحت سے متعلق شعبوں میں کٹوتیاں جاری رکھی جائیں؛ ''سنٹر فار ڈیزیز کنٹرول'' کے لئے بجٹ میں مزید کمی کر کے۔ ٹرمپ نے اپنی ساری مدّت کے دوران اس میں باقاعدگی سے کٹوتیاں جاری رکھیں۔ اور اب وبا کے دنوں میں ہمیں چاہیے کہ کٹوتیوں میں اضافہ کر دیں۔ مگر کچھ شعبے ایسے بھی ہیں جہاں کٹوتیوں کی ضرورت نہیں ہے، ہمیں ایندھن کے زیر زمین وسائل کی دریافت کرنے والی صنعتوں کو مزید رعایتیں عطا کرنی چاہیں۔ زیرزمین ایندھن کی صنعتیں کیا کر رہی ہیں؟ ایک منظم انسانی زندگی کے امکانات میں کمی کے لئے کوشاں ہیں اور پھر، بلاشبہ، ہمیں ایک بہت بڑی فوج پالنے کے لئے بھی مزید پیسہ رکھنا چاہیے۔ یہ ہے انتظامیہ کی ذہنیت، جو کہ دراصل اس رپبلیکن پارٹی کی ذہنیت کی عکاس ہے جو برسوں پہلے ریل (کی پٹڑی) سے دور چلی گئی تھی۔

لنڈا سولومان ووڈ: آپ نے بہت دِلچسپ تبصرہ کیا نوم، اور جب ہم پہلے بات کر رہے تھے آج رات کے آغاز سے قبل، تو آپ نے دو ایک ایسی باتیں کہی تھیں جو حقیقت میں، میرا خیال ہے کہ میں ساری عمر نہیں بھولنے لگی۔ آپ نے کہا تھا، جب میں نے آپ سے اس ٹوئیٹ کے بارے میں سوال کیا تھا جس کی کہ سُرخی لگی تھی جو میں نے دیکھی تھی، جب آپ نے کچھ اس طرح کی بات کہی تھی کہ ٹرمپ کو ووٹ دینا اس سے بھی بدتر ہوگا جیسے ہٹلر کو ووٹ دینا، یا ہٹلر کو ووٹ دینے سے بھی بدتر ہوگا اور آپ نے مجھ سے پھر یہ کہا کہ ٹرمپ آخری حد ہے... آپ نے یہ کہا تھا کہ اذیت پسندی کی آخری حد، جیسا کہ بدتر بہ نسبت... آپ نے کہا تھا کہ وہ اس سے بھی بدتر ہے۔

www.MashalBooks.org

نوم: میرے خیال میں یہ امر واضح ہے۔ میں ایسا برسوں سے کہتا آرہا ہوں۔ یہ اب بالکل واضح ہو چکا ہے۔ آئیں ایک نظر ڈالتے ہیں۔ ہٹلر شاید ایک یا ہو سکتا ہے کہ انسانی تاریخ میں بدترین مجرم ہو۔ وہ 60 لاکھ یہودیوں کو مار ڈالنا چاہتا تھا؛ میرے رشتے دار بھی اس کے ہاتھوں مارے گئے تھے؛ تین کروڑ سلیوز (Slavs)، روما، ہم جنس پرست (مرد)، اور دیگر لوگ۔ یہ بہت ہی افسوسناک ہے۔ تاہم ٹرمپ کیا کرنا چاہتا ہے؟ وہ ایک منظم انسانی زندگی کے امکانات بھی ختم کر دینا چاہتا ہے سب کچھ۔ ٹھیک ہے؟ اور مستقبل قریب میں۔ زیر زمین ایندھن کے زیادہ سے زیادہ استعمال، ان تمام قواعد پر حملے کا جو اس میں کمی کے لئے، خطرے کو محدود کرنے کے لئے بنائے گئے ہیں، یہی مقصد ہے۔ دراصل، ہمیں محفوظ کردہ دستاویزات پر نظر ڈالنی چاہیے۔ شاید وہ بدترین دستاویز، جو کہ نازی دور سے ہی ہمارے علم میں ہے، 1942 کا وہ اعلامیہ ہے جس کے تحت انہوں نے بنیادی طور پر تمام یہودیوں کو ہلاک کرنے اور یوریشیا کو فتح کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا، وغیرہ وغیرہ۔ خوب، تو اب ہم ٹرمپ انتظامیہ کی طرف آتے ہیں۔ اس حوالے سے دلچسپ ترین دستاویز وہ ہے جس کا کہ اخبارات وغیرہ میں ذکر کیا گیا تھا، کوئی دو برس قبل۔ ''نیشنل ٹرانسپورٹیشن ایجنسی'' کی طرف سے تیار کردہ وہ دستاویز جو کہ ماحول کی صورتحال کے حوالے سے کی گئی طویل، سینکڑوں صفحات پر مُشتمل تشخیص تھی، اور انہوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ اس صدی کے اختتام تک عالمی حدّت قبل از صنعتی دور کے درجوں سے چار درجے سیلسیئس (Celsius) اوپر چلی جائے گی۔ اب اس قسم کی صورتحال کو تقریباً ہر تجزیہ نگار تباہ کُن قرار دے رہا ہے اور انہوں نے اس سے ایک نتیجہ اخذ کیا۔ نتیجہ یہ اخذ کیا گیا کہ ہمیں اخراج کو محدود کرنے کی مزید کوششیں ترک کر دی جائیں۔ ہمیں گاڑیوں کے حوالے سے اخراج کم کرنے کی مزید کوئی کوشش نہیں کرنی چاہیے اور اس کی منطق ایک طرح سے واضح ہے۔ ہم تباہی کے کنارے کی طرف تو بڑھ ہی رہے ہیں تو کیوں نہ لطف اندوز ہوا جائے اور منافع کما لیا جائے؟ اس کا 1942 کے اعلامیے سے کس طرح موازنہ بنتا ہے؟ ہمیں یہ صورتحال ہر قدم پر نظر آتی ہے، تو مسئلہ صرف عالمی حدّت کا نہیں ہے بلکہ ہمیں زیادہ امریکیوں کو ہلاک کرنا ہے۔ تو اب، مثال کے طور پر، آپ بحران کے عین وسط میں دیکھیں۔

ماحولیاتی تحفظ کا ادارہ (EPA) جو کہ کسی کاروباری ادارے کے زیر انتظام یا ماتحت ادارہ نہیں ہے، وہاں پر سرگرمی سے کام کرنے والے سائنس دانوں کو خاموشی سے نکال باہر کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ ادارے نے بعدازاں فیصلہ کیا کہ کوئلے سے چلنے والے کارخانوں سے لے کر دیگر ماحول دشمن شعبوں تک کے لئے اخراج سے متعلق قوانین نرم کر دیئے جائیں، بلکہ ان کا خاتمہ کر دیا جائے۔ ہمیں پانی کی گذرگاہوں میں پارہ پھینک دینا چاہیے۔ انہیں آلودہ کر دینا چاہیے، بہت سے بچوں کو ہلاک کر دینا چاہیے۔ کیوں؟ تاکہ ان کی جیب میں کچھ اور ڈالر چلے جائیں۔ جب ایک مرتبہ قواعد وضوابط نرم ہونا شروع ہو جائیں گے تو پتہ چلے گا کہ آیا وہ اوباما حکومت کی طرف سے اخراج کی حد طے کرنے کی کوششوں کا رُخ پلٹ دیں گے؟

لنڈا سولومان ووڈ: آپ کا شمار دنیا کے معروف ترین اور معزز ترین سماجی ناقدین میں ہوتا ہے۔ میں حیران ہوں کہ اس طرح کی صورتحال تبدیل کرنے کے لئے جس کا کہ آپ ذکر کر رہے ہیں، آپ ہمیں کیا مشورہ دینا چاہیں گے؟

نوم: زیادہ مُشکل کام نہیں ہے۔ مقبول عوامی تحریکیں۔ ہم نے ماضی میں اس سے بھی مُشکل کام کئے ہیں: کارکنوں کی تحریکیں، شہری حقوق کی تحریکیں، ارتقاء پسندوں کی تحریکیں، جنگ مخالف تحریکیں۔ ان کی بدولت ملک میں عظیم تبدیلیاں آئیں۔ تو آپ زیر زمین ایندھن کی صنعت کو ہی لے لیں، تیل کی قیمتوں کو دیکھیں... بہت کم ہیں۔ امریکہ، کینیڈا، اور دیگر صنعتوں کو نیچے سے اوپر کی سمت سماجی افادیت کا حامل بنا سکتے تھے (یا پھر ایک ماہ کے لئے؟، ناقابل سماعت)، یعنی کم مہنگی اور پھر کاروبار کے میدان سے باہر۔ اس طرح دنیا کو بہت فائدہ ہو جاتا۔ آپ یہ سب کچھ ایک دن میں نہیں کر سکتے کہ مراجعت کرتے ہوئے منافع کو ایسے وسائل کے لئے وقف کر دیں جو آپ پرانے وسائل کی جگہ لانا چاہتے ہیں اور اس سے توانائی کے پائیدار وسائل خرید لیں۔ اس میں کتنا وقت لگے گا؟ بہت ماہر قسم کے معیشت دانوں نے اس حوالے سے محتاط اندازے لگائے ہیں کہ اس کے لئے کتنا وقت اور مصارف درکار ہوں گے، تاکہ ایسی پالیسیاں جاری رکھی جا سکیں جو بنیادی طور پر اتنے بڑے ماحولیاتی بحران کی روک تھام کریں۔ آپ اس کا خاتمہ نہیں کر سکتے۔ ہم

پہلے ہی بہت نقصان کر چکے ہیں، تاہم اسے قابل قبول حد (جہاں زندگی کا تسلسل جاری رہے) میں رکھنے کے لئے ہمیں بہت کم وسائل درکار ہیں، اس سے بھی کم جو جنگ عظیم دوئم جاری رکھنے پر صرف ہوئے، اور پھر اب ہمارے ممالک بھی بہت امیر ہیں، تو کیا ایسا ممکن ہے؟ ہاں تو، درحقیقت ایسا ممکن ہے، اور یہ ان اہم مسائل میں سے واحد ہے جو ہمیں درپیش ہیں۔ اور مسائل بھی ہیں جن کے بارے میں لوگ بات نہیں کر رہے مگر وہ بھی اتنی ہی شدت کے حامل ہیں۔ ٹرمپ انتظامیہ نے انسانی زندگی کے حوالے سے جو ایک اہم قدم اُٹھایا ہے وہ اسلحے کی روک تھام کے اس مروجہ نظام کا خاتمہ ہے جس کے تحت تباہ کن ایٹمی ہتھیاروں سے کچھ تحفظ حاصل تھا اور جس کسی نے اس معاملے میں متعلقہ دستاویزات کا جائزہ لیا ہے اسے پتہ چلے گا کہ صورتحال کتنی دہشتناک ہے۔ یہ کسی معجزے سے کم نہیں ہے کہ ہم ابھی تک بقید حیات ہیں، اور اس موضوع پر گفتگو کر رہے ہیں۔ تو اب ٹرمپ کا فیصلہ یہ ہے کہ صورتحال مزید بگاڑ دی جائے۔ چنانچہ گذشتہ اگست میں ٹرمپ نے آئی این ایف (INF) معاہدے میں دراڑیں ڈالنے کا کام کیا جو کہ ریگن کی طرف سے پایہ تکمیل تک پہنچایا گیا تھا نہ کہ کسی بائیں بازو کی شخصیت کی طرف سے۔ ریگن اور گورباچوف میں 1987 میں درمیانے درجے کی ایٹمی طاقتوں کا معاہدہ طے پایا تھا جس کی بدولت ایٹمی جنگ کا خطرہ کافی حد تک کم ہو چکا ہے۔ ٹرمپ نے اس سے انحراف کا راستہ اختیار کیا اور روس کے علاوہ کسی بھی اور فریق پر اپنا مقصد واضح کرنے کے لئے اس معاہدے سے بھر جانے کے چند دنوں کے اندر اندر اس نے ایک میزائل چھوڑا جو کہ معاہدے کی کھلی خلاف ورزی تھی۔ اس کی بدولت پیوٹن کو یہ پیغام ملا کہ برائے مہربانی ایسے ہتھیار بناؤ جو ہمیں تباہ کر دیں اور یہ تخفیف اسلحہ کے لئے بہت زبردست ہوگا جیسا کہ اسلحے اور جنگی صنعت کے لئے بھی۔ دراصل آپ اگر ان کے اعلانات کو دیکھیں تو وہ اس شے سے محبت کرتے ہیں۔ انہیں بہت بڑا محرّک مل رہا ہے، اسلحے کی صنعت کے لئے بہت سا پیسہ تا کہ ہر شے کو تباہ کر دیا جائے اور پھر انہیں اگلے مراحل پر اور بھی پیسہ مل جائے گا تا کہ پھر ان ہتھیاروں کے خلاف دفاع تعمیر کیا جائے جو کہ ہم دوسروں کو بنانے کی ترغیب دے رہے ہیں۔ اس ماردھاڑ منصوبے کا اگلا مرحلہ جو ابھی دو ایک روز قبل اعلان کیا گیا ہے ''اوپن سکائیز ٹریٹی ہے

جو کہ آئزن ہاور کے دور میں کیا گیا تھا۔ ''اوپن سکائیز ٹریٹی'' کی بدولت حادثاتی ایٹمی جنگ کا خطرہ ایک بار پھر کم ہو گیا ہے کافی حد تک، لہٰذا اس سے جان چھڑا لینی چاہیے۔ اب فہرست میں آخری ترجیح دراصل ایک عدد ''نیوسٹارٹ (New START) نامی معاہدہ رہ گیا ہے جس کے تحت روس اور امریکہ کو میزائلوں اور ایٹمی وارہیڈ کی تعداد کم کرنی پڑے گی۔ پیوٹن کو، جس کو ضرورت ہی نہیں ہے، اس لئے وہ امریکہ سے بار بار یہی التجا کر رہا ہے کہ اس معاہدے پر نظر ثانی کی جائے۔ اس کے نفاذ کا وقت، اگلا برس قریب آ رہا ہے، تاہم امریکہ یعنی ٹرمپ انتظامیہ اس پر عمل نہیں کرے گی۔ اُنہوں نے چال یہ چلی ہے کہ اسے نافذ ہونے سے روکنے کے لئے عذر یہ تراشا ہے کہ ایک ایسے وسیع تر معاہدے کی ضرورت ہے جس میں چین بھی شامل ہو۔ یہ ایک فضول قسم کا لطیفہ ہے۔ چین کے ایٹمی وسائل ابھی اتنے بھی نہیں ہوئے کہ ''سٹارٹ'' معاہدے کے کم سے کم درجے کے قریب ہی آ جائیں۔ یہ صرف ایک چال تھی کہ زرد خطرے (چین کی طرف سے) کا ہیجان پیدا کر کے ''نیوسٹارٹ'' پر دستخط کرنے سے صاف انکار کر دیا جائے اور جب ایسا ہو جائے گا تو ہم اسلحے کی روک تھام کا مقصد حاصل کر چکے، یہ کتنی سنجیدہ صورتحال ہے؟

لنڈا سولومان ووڈ: یہ تو بہت گمبھیر صورتحال ہے۔ میرا آپ سے ایک سوال اور ہے اس سے قبل کہ میں لوگوں کے سوال آپ سے پوچھنا شروع کروں؛ ہمارے پاس بہت سے سوال ہیں اور ہم اتنے سوال و جواب نہیں کر سکیں گے جتنے کہ ہم چاہتے ہیں، تاہم میں آپ کو واپس اسی نکتے پر لانا چاہتی تھی جہاں کہ ہم اس وقت ہیں اور پوچھنا چاہوں گی کہ آپ نے ایک لمبی، بھرپور اور حیرت انگیز زندگی گذاری ہے... آپ کے خیال میں آپ اس وقت کی صورتحال کو کیسے دیکھتے ہیں جبکہ کووڈ۔19 کی وبا پھیلی ہوئی ہے اور آپ اس لمحے میں دنیا کو کس طرح سے دیکھتے ہیں۔

نوم: آپ کی والدہ تقریباً میری عمر کی ہوں گی، میرے اندازے کے مطابق۔ ان کی یادیں بھی میری جیسی ہوں گی۔ یہ سب کچھ بچپن کی ابتدائی یادوں کو اجاگر کرنے کا معاملہ ہے۔ 1930 کے عشرے کے شروع میں آپ دیکھ سکیں گی کہ یہ ایک فسطائی وبا/طاعون کے منظر عام پر ظاہر ہونے کا زمانہ تھا۔ دراصل مجھے یاد ہے کہ میں نے جب پہلا مضمون لکھا تھا وہ 1939 کا زمانہ تھا، بارسلونا کے

فرانس کے زیر تسلط آجانے کے عین بعد کا زمانہ۔ یہ ایک ایسے دہشتناک سائے کے پھیلاؤ کا زمانہ تھا جو ہر خاص و عام کو اپنی لپیٹ میں لے رہا تھا۔ نازیوں نے پہلے آسٹریا پر اور پھر چیکوسلواکیہ پر تسلط قائم کرلیا تھا؛ اسپین بھی ان کے قبضے میں آگیا... یہ سلسلہ کہاں پر جا کے رُکتا؟ یوں لگتا تھا کہ وہ ہر اس شے پر قبضہ کرلیں گے جو میرے بچپن کی یادوں میں محضوظ ہے۔ اس کے علاوہ یادداشت میں اور بھی بہت کچھ محفوظ ہے۔ میں اس پر وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا مگر بات اسی نکتے پر واپس آتی ہے۔ اس وقت دنیا کے سامنے دو ترجیحات تھیں۔ عظیم کساد بازاری کے اثرات بہت شدید تھے، اس سے بھی زیادہ جو کہ اس وقت ایک بہت غریب ملک پر ہیں اور اس سے نکلنے کے دو ہی راستے تھے۔ ایک تو فسطائیت جو کہ دنیا کے اکثر ممالک کو لپیٹ میں لئے ہوئے تھی اور دوسرا طریقہ بنیادی طور پر ''نیوڈیل'' کی طرز کا، فلاحی ریاست کی طرح کا، جمہوریت اور آزادانہ نظریات کا تھا۔ یہ ایک اور طریقہ تھا۔ یہ وہ طریقہ تھا جو امریکہ نے اپنایا، اس کی بدولت کساد بازاری پر قابو پایا، ایک طرح کا خانہ بند (Regimented) سرمایہ دارانہ نظام جو لوگوں کے لئے انتہائی فائدہ مند تھا۔ اب اسے نوآزاد معاشی نظام کے دور میں اگرچہ تباہ و برباد کیا جا رہا ہے، تاہم یہ طویل عرصے تک بہت موثر قسم کا نظام تھا۔ یہی دو طریقے ہیں۔ ہم اب اسی طرح کی صورتحال سے دو چار ہیں، عین اس طرح تو نہیں، نہ ہی دو صورتیں بالکل یکساں ہو سکتی ہیں، تاہم راسے دو ہی ہوتے ہیں؛ یا تو ہم دنیا کو اس قدر سخت اور ظالمانہ بنا دیں کہ قلیل مدّتی تباہی کے راستے پر گامزن ہو جائے یا پھر ہم ان مسائل پر ان وسائل کی بدولت قابو پا سکتے ہیں جو کہ پہلے سے ہی ہمارے ہماری دسترس میں ہیں۔ تاہم جیسا کہ میں نے کہا ہے دوسری جنگ عظیم کو زور شور سے جاری رکھنے کے لئے جو خرچ آیا تھا اس کا تھوڑا سا تناسب، محض معمولی سا تناسب ماحولیاتی بحران کو حدود میں رکھنے اور اس امر کی یقین دہانی کے لئے کافی رہے گا کہ انسانوں کے علاوہ دیگر انواع بقید حیات رہ جائیں گی۔ ایٹمی ہتھیار اگر سیدھے چل جائیں گے تو ان کی زندگی کا کوئی جواز باقی نہیں رہے گا۔ ان ہتھیاروں میں خاطر خواہ کمی کی جا سکتی ہے، تیزی سے کمی بلکہ خاتمہ بھی ٹھیک رہے گا اور پھر ہم دیگر بحرانوں کی طرف متوجہ ہو سکتے ہیں، مثلاً اقتصادی بحران جن کا نتیجہ ایک ایسی

دنیا کی صورت میں نکلتا ہے جس میں 0.1 فی صد لوگوں کے پاس دنیا کی کل دولت 20 فی صد ہے اور باقی لوگ ایک ہفتے کے سامان/ضروریات کے لئے سرگرداں رہتے ہیں۔ اس طرح کی زندگی کا کوئی جواز نہیں ہے۔ ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ اس (صورتحال) کو کس طرح ختم کیا جا سکتا ہے۔ دراصل ہم ایسے طریقے اختیار کرتے رہے ہیں۔ تاہم اس طرح کے راستے یا طریقے 1930 کی دہائی کے ابتدائی ایام کی یاد دلاتے ہیں۔

لنڈا سولومان ووڈ: میرے پاس بہت سے سوالات ہیں اور جو فہرست میں سب سے اوپر نظر آتا ہے وہ رابرٹ ہیکٹ کی طرف سے ہے اور میں ہر ایک کو یہ بتانا چاہتی ہوں کہ اگرچہ اس سوال کے بہت سے حمایتی ہیں مگر میں دوسرے (نمبر پر) سوال کی طرف آنا چاہتی ہوں کیونکہ میرے خیال میں یہ اس موضوع کے تسلسل کو بہت اچھی طرح برقرار رکھتا نظر آتا ہے جسے ہم پہلے سے ہی زیر بحث لاتے چلے آرہے ہیں اور پھر میں باب کے سوال کی طرف آتی ہوں۔ یہ سوال جیمز ڈوئل کی طرف سے ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ میں 14 برس کا ہوں۔ مجھے اپنا مستقبل واپس حاصل کرنے کے لئے کیا کرنا ہوگا؟

نوم: خوب، یہ بہت اچھا سوال ہے اور اس کا ایک بہت اچھا جواب موجود ہے۔ آپ یہ دیکھیں کہ دنیا کو ٹرمپ جیسے لوگوں کے ہاتھوں تباہ ہونے سے بچانے کے لئے محاذ پر آگے آگے کون کوششیں کر رہا ہے۔ یہ نوجوان لوگ ہیں۔ گذشتہ اکتوبر کو موسمیاتی تبدیلی کے مسئلے پر ہونے والے احتجاج پر نظر ڈالیں جب بامعنی قسم کے مظاہروں کا ایک سلسلہ دیکھنے میں آیا تھا تو اس وقت محاذ پر آگے آگے کون تھا۔ نوجوان لوگ۔ میری اپنی زندگی میں پیش آنے والے ڈرامائی واقعات میں سے ایک کو لے لیں جو کہ میرے خیال میں ساری دنیا میں ہر کمرہ جماعت کے اندر کھیلا/دہرایا جانا تھا اگر جنوری میں ڈیوس کانفرس کا انعقاد نہ ہوتا۔ ڈیوس کانفرنس کرنے والے وہ لوگ ہیں جو دراصل خود کو ''کائنات کا مالک'' کہتے ہیں۔ بڑے بڑے کاروباری اداروں کے انتظامی سربراہان، ذرائع ابلاغ کے بڑے بڑے اداروں کا انتظام چلانے والے تبصرہ نگار۔ یہ لوگ سال میں ایک مرتبہ ڈیوس، سوئٹزرلینڈ میں اکٹھے ہوتے ہیں، تیرا کی کرتے ہیں اور ایک دوسرے کو

www.MashalBooks.org

بتاتے ہیں کہ وہ کتنے زبردست قسم کے لوگ ہیں وغیرہ وغیرہ۔ اجلاس کا آغاز کیے بعد دیگرے دو مذاکروں سے ہوا۔ ایک ڈونالڈ ٹرمپ کی طرف سے تھا۔ لوگوں کے مطابق انہیں اس کا انداز کچھ اچھا نہ لگا، وہ ان کو بہت ہی بدنما محسوس ہو رہا تھا، اس کا انسان دوستی کا لبادہ اتر جاتا ہے، مگر انہوں نے اس کے لئے بہت جوش سے تالیاں بجائیں کیونکہ اسے معلوم ہے کہ ایک چیز ایسی ہے جو انہیں سمجھ آتی ہے اور وہ یہ کہ امیر لوگوں کو جیبوں میں پیسے کس طرح انڈیلے جائیں۔ تو اسے زبردست داد ملی۔ اگر آپ پر غور کریں تو یہ ایک دیوانے کی بڑ سے زیادہ کچھ نہیں تھا۔ اس کے بعد ایک نوجوان لڑکی کی باری تھی، گریٹا تھنبرگ۔ ایک سترہ برس کی لڑکی جس نے کافی حد تک مبنی برحقیقت باتیں کیں: بالکل درست، محتاط انداز میں سر پر منڈلاتے ہوئے بحران کو بڑی شستگی سے بیان کرتے ہوئے ان الفاظ کے ساتھ اختتام کیا: ''آپ لوگ زندگی کے حوالے سے ہماری کسی بھی اُمید کو برباد کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔'' اس کی بات پر کافی تالیاں بجیں، اور ستائش بھی کی گئی: ''پیاری سی ننھی بچی واپس اسکول کی راہ لو۔'' اور چودہ برس کے دوسرے نوجوانوں کی دنیا ہے جسے کہ تباہ کیا جا رہا ہے اور وہ اس دنیا کو بچانے کی کوششوں میں آگے آ گئے ہیں جبکہ پرانی نسل انہیں دغا دے رہی ہے اور انہیں معاملات واضح کر دینے کے لئے بھرپور طریقے سے کام جاری رکھنا ہوگا۔ میں پھر سے اصرار کروں گا کہ اجلاس کے افتتاح کی بصری عکاسی (Videotape) واقعی بے مثال ہے۔ یہ آپ کو دنیا کے بارے میں، خود ہمارے بارے میں بہت کچھ بتاتی ہے۔

لنڈا سولومان ووڈ: اب، یہ سوال رابرٹ ہیکٹ کی جانب سے ہے جو کہ ''نیشنل آبزور'' کے لئے لکھتے ہیں۔ ''نوم صاحب کو میرا سلام، جب میں نے ''نیشنل آبزور'' کے لئے آپ کے مضمون کے حوالے سے گذشتہ برس آپ کا انٹرویو کیا تھا تو آپ نے پیش بینی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ وبائیں اور موسمیاتی تبدیلی دونوں ہی ایک منظم انسانی زندگی کے لئے خطرہ ہیں اور ساتھ ہی یہ بھی کہ بڑے پیمانے کی عوامی تحریکیں موسمیاتی تبدیلی کا مطالبہ کرنے اور اس کی شدّت میں کمی لانے کے لئے اہم کردار ادا کر سکتی ہیں۔ آپ کا کیا خیال ہے کہ وباؤں کی بدولت ان دونوں امکانات، یعنی نیستی یا بغاوت میں کونسا غالب نظر آتا ہے۔ ہمیں یہ وبا ایک زیادہ ماحول دوست معیشت کی

تنظیم کرنے کے حوالے سے کیا سبق دیتی ہے۔

نوم: یہ بہت اہم نکتہ ہے۔ ہم جو کچھ دیکھ رہے ہیں وہ ایک ہی انتہا کے کئی پہلو ہیں۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ ٹرمپ انتظامیہ اس وبا کی شدت میں اضافہ کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ میں نے اس حوالے سے کوئی زیادہ بات نہیں کی مگر کی جا سکتی ہے۔ دوسری طرف، ہم واقعی جرأت مند قسم کے لوگوں کو دیکھ رہے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ ڈاکٹر اور نرسیں جو اگلی صفوں میں کام کر رہے ہیں جو کہ ناقابل یقین کردار ہے۔ وہ لوگ کی زندگیوں کی اور خطرناک حالات میں ان کی بقا کی جنگ لڑ رہے ہیں، مگر کسی قسم کے انتظام کے بغیر کیونکہ حکومتوں نے انہیں ایسی کوئی سہولت ہی فراہم نہیں کی اور پیسہ کسی اور جگہ ضائع کرنے کو ترجیح دی ہے۔ اس کے باوجود یہ لوگ مسلسل اگلے محازوں پر کام کر رہے ہیں، ساری دنیا میں بشمول چین، امریکہ، اور کینیڈا کے۔ یہ ایک طرح سے انسانی جذبے کی عظمت کی علامت ہے۔ یہ ہمارے لئے ایک مثال ہے کہ کیا کچھ کیا جا سکتا ہے اور ابھی دنیا میں اور بھی بہت کچھ ہو رہا ہے بشمول امریکہ کے۔ اپنی مدد آپ کے تحت باہمی تعاون کرنے والی تنظیمیں یا پھر بے ساختگی سے منظم ہونے والی ایسی انجمنیں جن میں لوگ اِکٹھے ہو کر کوشش کرتے ہیں کہ ضرورت مندوں کی مدد کی جائے، بوڑھے لوگوں کو کھانا کھلایا جائے، جو کہ الگ تھلگ زندگی گذار رہے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ مصائب کا شکار لوگوں کی مدد کرنی ہے اور یہ ہر جگہ ہو رہا ہے، بعض اوقات تو بڑے حیران کُن انداز میں۔ اس کی انتہا درجے کی مثال جو میرے علم میں ہے، وہ برازیل کی ہے۔ ریئو کے پسماندہ علاقوں میں، کچی آبادیوں کی حالت انتہائی خستہ ہے۔ اس طرح کی مایوس کن حالت میں زندگی گذارنے والوں کو آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ بار بار ہاتھ دھوئیں کیونکہ ان کے پاس پانی نہیں ہوتا۔ وہاں ایک چھوٹے سے کمرے میں کئی لوگ ٹھنسے پڑے ہوتے ہیں۔ حکومت ان کی کوئی مدد نہیں کرے گی، یہ بھی امریکہ کی طرح کی صورتحال ہے، نہیں ہم کوئی مدد نہیں کرتے۔ تاہم وہاں ایک ایسی تنظیم ہے جو انکی مدد کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ کیا آپ کو معلوم ہے یہ کون لوگ ہیں؟ مجرموں کے جتھے جو کہ مقامی باشندوں کو دہشت زدہ کرتے چلے آ رہے تھے اور اب وہ متحد ہو کر کوشش کر رہے کہ ان خستہ حال بستیوں کے مکینوں کی مدد کی جائے

www.MashalBooks.org

کہ وہ بقید حیات رہ جائیں۔آپ کو ایسی چیزیں ساری دنیا میں ہوتی ہوئی نظر آئیں گی۔اس کے علاوہ بھی بین الاقوامی سطح پر ایک کام ہورہا ہے۔''پروگریسوانٹرنیشنل'' نام کی ایک تنظیم تشکیل کی جارہی ہے جو اپنا پہلا اجلاس نومبر میں شروع کرے گی۔اس کا آغاز امریکہ میں برنی سینڈرز نے اور یونان کے سابق سیکرٹری خزانہ یونس ویروفاکس نے، جو کہ ایک زبردست معیشت دان بھی ہے، یورپ میں کیا تھا؛ وہ ڈائم 25(DiEM 25) نامی ایک تنظیم کا بانی بھی ہے، یورپ میں کام کرنے والی ایک ایسی تنظیم جس کی کوشش ہے کہ یورپین یونین کا ایک بامعنی قسم کے ادارے کا تاثر بحال کرنے کے ساتھ ہی اس کے بنیادی نقائص کا بھی خاتمہ کردیا جائے۔چنانچہ وہ ''پرگریسوانٹرنشنل'' کا ایک اجلاس بُلا رہے ہیں جو پوری دنیا سے متحرک تنظیموں کو یکجا کردے گا۔اس کے علاوہ تمام پسماندہ مما لک(Global South) کو بھی دعوت دی جائے گی جو کہ اس وبا کا سب سے زیادہ نشانہ بنیں گے اور وہ یہ اُمید کررہے ہیں کہ اس شے کی روک تھام کی جائے جو کہ ہماری آنکھوں کے سامنے پرورش پا رہی ہے اور جسے زیادہ زیر بحث نہیں لایا جاتا۔ایک رجعت پسند بین الاقوامی گروہ ،انتہائی ظالمانہ بین الاقوامی گروہ، سخت رجعت پسند قسم کی ریاستیں بھی ''وائٹ ہاؤس'' کی چھتری تلے منظم ہورہی ہیں، بشمول برازیل کے بولسونارو کے جسے کہ ٹرمپ سے بھی بدتر بیان کیا جاتا ہے ۔تاہم برازیل زیادہ نقصان نہیں پہنچا سکتا کیونکہ وہ اتنا طاقتور ملک نہیں ہے۔وہ دراصل یہ کررہا ہے کہ امیزن (Amazon) کا نام ونشان مٹا کر، جو کہ بہت خطرناک قسم کے اثرات کا حامل ہوگا، دنیا کی تباہی میں معاونت کی جائے۔ملک میں وبا سے متاثر لوگوں کے بارے میں اس کا کہنا ہے کہ یہ محض زکام ہے اس لئے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے، باہر نکلیں، ریستوران وغیرہ میں جاؤ، اپنی پسند کے۔لہٰذا وہ اس کا حِصّہ ہے۔اگر مشرق وسطیٰ کی طرف جائیں تو مصر میں عبدالفتح السسی کی آمریت ہے ،مصر کی تاریخ کی بدترین آمریت۔اسی طرح خلیج کی ریاستوں میں خاندانی آمریتوں کا نظام ہے۔بہت سخت ظالمانہ آمریت۔اسرائیل دائیں سمت میں اس قدر آگے بڑھ چکا ہے کہ آپ اس کو سیدھا مرکز میں ہرگز نہیں دیکھتے۔اس سے آگے چلیں تو مودی کا انڈیا آجاتا ہے۔مودی بھی انڈیا کی سیکولر یا غیر جانبدار جمہوریت کی تباہی کے درپے ہے اور اس

کی جگہ دائیں بازو کی انتہائی پسند ہندو قوم پرستی پر مبنی عملی قسم کی آمریت میں بدل رہا ہے۔یورپ میں وکٹر اوربن کے اقدامات ہنگری کی جمہوریت کو آمریت میں بدل رہے ہیں۔اسی طرح اٹلی میں سالوینی (Salvini) اس امر کو یقینی بنا کر تسکین حاصل کرتا ہے کہ اس کے چھوٹے سے حلقے میں آگھسنے والے بحری جہاز بحیرہ روم کی ہلاکت خیزی کا شکار ہوجائیں۔اس طرح کے کرداروں سے ساری دنیا کے لوگ بھاگتے ہیں۔یہی کچھ ٹرمپ انتظامیہ کے جغرافیائی طور پر کلیدی اہمیت کے حامل پروگرام کے تحت ہورہا ہے۔توہمیں اس کا مقابلہ ''پروگریسوانٹرنیشنل'' کے ساتھ کرنا چاہیے۔ خوب، تو کیا یہ ممکن ہے؟ اگر تو آپ ریاست کی سطح پر دیکھیں تو انہیں یہ سب کچھ توازن سے باہر نظر آتا ہے۔آپ لوگوں کے درجے پر دیکھیں تو یہ سچ نہیں ہے۔دنیا میں بہت سے لوگ وہی کچھ چاہتے ہیں جو کہ ''پروگریسوانٹرنیشنل'' کا موقف ہے۔تو اس سوال کا جواب یہ ہے کہ آیا انہیں قبضہ کرنے کے لئے متحرک کیا جاسکتا ہے؟ میں یہ کہنا چاہوں گا کہ جو لوگ اس دنیا کے مالک ہیں وہ اس کے لئے متفکر ہیں۔ہم واپس ڈیوس کانفرنس کی طرف جاتے اور ذرا چشم تصور سے دیکھتے ہیں۔ یہ خود دلچسپ کانفرنس تھی۔عموماً ہر برس، یہ محض خود ستائش کا عمل ہوتا ہے۔اس برس موڈ ذرا مختلف تھا۔وہاں پر اہم لوگوں نے تسلیم کرلیا تھا کہ کسان لوگ دوشاخے (Pitchforks) کے ساتھ آرہے ہیں، اب ہمیں کچھ نہ کچھ کرکے دکھانا پڑے گا۔چنانچہ کانفرنس کا موڈ یہ تھا کہ ہمیں گذشتہ برسوں کیے دھرے پر معذرت کرنی ہوگی۔ہاں، ہم نے غلط کام کئے، ہم نے لوگوں کو نقصان پہنچایا تاہم اب ہمیں شعور آگیا ہے، اس لئے ہم اب ہم زیادہ شریفانہ وانسان دوست طرز عمل کا مظاہرہ کرنے لگے ہیں، ہم نہ صرف حصص رکھنے والوں اور انتظامی سربراہان کی فکر کریں گے بلکہ محنت کشوں اور ان کی بستیوں کا بھی خیال رکھیں۔ہم واقعی بہت اچھے بچے ہیں اور آپ اپنے مستقبل کے حوالے سے ہم پر اعتماد کریں، ہم آپ کا خیال رکھیں گے۔ڈیوس میں اس طرح کا موڈ تھا تاہم انہوں نے ہمیں یہ بتانے کی زحمت نہیں کی کہ اس طرح کا طرز تخاطب ہمیں پہلے بھی محسوس ہوا تھا۔چنانچہ 1950 کے عشرے میں کچھ اس طرح کا تاثر دیا گیا کہ کارپوریشنیں اب سے روح پرور قسم کے اداروں میں تبدیل ہونے لگ جائیں گی جہاں انسانی جذبات ابل ابل کر چھلک رہے ہوں گے

www.MashalBooks.org

۔نوع انسانی کی خیر خواہی سے بھرپور، حیرت انگیز طور پر روح پرور کارپوریشنیں۔ بہت خوب، ہم
نے 60 برس میں دیکھ لیا ہے کہ یہ کتنی روح پرور بن چکی ہیں۔ تاہم، قابل غور نکتہ یہ ہے کہ اب یہ
بوکھلائے پھر رہے ہیں، انہیں نظر آ رہا ہے کہ کیا ہو رہا ہے۔ کاشتکار آ رہے ہیں اپنے دو
شاخوں کے ساتھ۔

لنڈا سولومان ووڈ: یہ واقعی دلچسپ صورتحال ہے اور میں آپ کو ابھی یہی بتانا چاہ رہی تھی کہ ہمارے
پاس ابھی بہت سے اور سوالات بھی ہیں۔ ڈیوکڈی یہ پوچھ رہا ہے کہ آیا آپ بلیک راک (Black
rock) کی طرف سے لاحق خطرات کے حوالے سے تبادلہ خیال کر سکتے ہیں۔ وال اسٹریٹ کی وہ
سرمایہ کار فرم جس کا دعویٰ ہے کہ وہ ماحول دوست راستہ اپنانے لگی ہے، اس کے باوجود اس نے
ادھر بہت زیادہ سرمایہ کاری کی اور ایندھن کے زیر زمین ذخائر کی بدولت عالمی معیشت کھربوں
ڈالر کی سطح پر پہنچ چکی ہے۔ ہمیں اس حوالے سے کس قدر متفکر ہونا چاہیے کہ بینک آف کینیڈا نے
حال ہی میں ''بلیک راک'' کو اپنا مُشیر مقرر کیا ہے تا کہ وہ کارپوریشنوں کے لئے درکار اضافی پیسہ
فراہم کرنے (Quantitative easing) کے نئے پروگرام کے حوالے سے رہنمائی کرے۔ کینیڈا
کی حکومت کو اس امر کی ترغیب دینے کی کاوشیں کتنی اہم ہیں کہ وہ بلیک راک سے تعلقات قطع
کر لے؟

نوم: بہت اچھا، یہ سماجی ہمدردی رکھنے والی کارپوریشنوں کا تصور اجاگر کرنے کی حکمتِ عملی کا حصّہ
ہے۔ وہ ایسا نوع انسانی کی محبت میں نہیں کر رہے۔ وہ ایسا اس لئے کر رہے ہیں کہ ان پر اس
حوالے سے بہت دباؤ ہے۔ جے پی مورگن چیز کی طرف سے، جو کہ امریکہ کا سب سے بڑا بینک
ہے، ایک یادداشت جاری کی گئی ہے کہ ہمیں ساکھ کے حوالے سے بہت دباؤ کا سامنا ہے۔ اس کا
کیا مطلب ہے؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں ہمارے دروازے پیٹ رہے ہیں اور ہمیں یہ
بتا رہے ہیں کہ انہیں وہ پسند نہیں ہے جو کچھ کہ ہم کر رہے ہیں، اس لئے بہتر یہی رہے گا کہ زیر زمین
ایندھن کے وسائل کے لئے سرمایہ کی فراہمی میں کمی کی جائے۔ ٹھیک ہے، آپ کو معلوم ہے کہ آپ
کوئی ایسی تدبیر اختیار کر سکتے ہیں، میرا مطلب ہے کہ ان اداروں کو تباہ کرنے کے علاوہ، جو کہ

میرے خیال میں کی جانی چاہیے، تاہم کافی حد تک اسی طرح کی۔ ان پر کافی دباؤ ڈالا جا سکتا ہے
کہ وہ کم سے کم روح پرور بننے کی طرف تو آ جائیں، ایک اچھا تاثر پیدا کرنے کے ساتھ ہی کچھ
بہتر لے آئیں اور اس سے آگے بھی بڑھنے کی کوشش کریں۔ تاہم یہ جو کچھ آپ بیان کر رہے ہیں
وہ ایک ایسے مسلسل عوامی دباؤ کی اہمیت کی طرف اشارہ ہے جس کا کہ کافی اثر پڑا تھا۔ مثال کے
طور پر، امریکہ میں ''گرین نیوڈیل'' کا تصور ہی دیکھ لیں۔ گرین نیوڈیل'' کی کوئی نہ کوئی شکل بقا
کے لئے ناگزیر ہے۔ کوئی دو برس قبل کی بات ہے، اس چیز کا قانون ساز اسمبلی میں بہت چھوٹی سی
''سن رائز موومنٹ'' نامی تنظیم، نوجوان کارکنان کی تنظیم، پہلے سوال کی طرف آتے ہوئے، اس
کے کارکنوں نے اسے کانگرس میں بھجوانے کے لئے بہت دباؤ ڈالا۔ وہ کانگرس کے دفاتر میں جا کر
بیٹھنے کی حد تک پہنچے یا نہیں مگر انہوں نے دیکھا کہ انہیں کانگریس کے بعض نوجوان نمائندوں کی
حمایت حاصل تھی جو کہ دفتر میں سینڈرز کی مُہم کے دباؤ کے تحت آئے تھے، خاص طور پر الیگزینڈریا
اوساسیو۔ کورٹیز، مقامی رائے دہندگان اور پھر میسا چوسٹس سے سینیٹر ایڈ مارکی بھی ان کے ساتھ
شامل ہو گیا جو کہ ماحولیاتی معاملات میں دلچسپی لیتا آ رہا تھا۔ اور اب یہ قانون سازی کے لئے منتخب
موضوعات کی فہرست میں شامل ہے۔ اب اس کا مزید مذاق نہیں اڑایا جاتا۔ ہوسکتا ہے کہ بات
آگے بڑھ جائے، ہوسکتا ہے کہ ہم بقید حیات رہ جائیں۔ یہ معاملہ (ناقابل سماعت) اور ہمیں
ماضی میں بھی ایسی صورتحال درپیش رہی ہے۔ میرا مطلب ہے کہ ایک نظر 1960 کے امریکہ پر
ڈالیں۔ اس وقت اس کا شمار دنیا کے آزاد ترین ممالک میں ہوتا تھا، یہاں مخلوط انسل لوگوں کی
شادیوں پر پابندی کا قانون بھی موجود تھا جو اتنا سخت تھا کہ نازیوں نے اسے اپنانے سے انکار کر
دیا۔ یہاں پر وفاقی قوانین بھی موجود تھے جن کے تحت وفاقی حکومت کی بعد ازاں معاونت سے
ملنے والی رہائش گاہوں کو الگ کرنا پڑا۔ سیاہ فاموں کے لئے کوئی جگہ نہ تھی۔ خواتین سے ابھی تک
انہی بنیادی قوانین کے تحت برتاؤ کیا جاتا تھا جو کہ ملک کی برطانیہ سے آزادی کے وقت نافذ کئے
گئے تھے جن کے تحت خواتین تکنیکی لحاظ سے جائیداد سے محروم رہتی تھیں اور وہ باپ کے بعد عورت
کے خاوند کو منتقل کر دی جاتی تھی۔ یہ اگرچہ چند برسوں میں غیر اہم قانون بن کر رہ گیا تھا، تاہم

www.MashalBooks.org

ایسا 1975 سے قبل نہیں ہوا تھا جبکہ خواتین کی تحریک کے زیر اثر عورتوں کو قانونی طور پر مساوی حیثیت دے دی گئی۔ انہیں وفاقی سطح پر جیوری میں بیٹھنے کا حق بھی مل گیا تھا۔ ہم اسی طرح بہت سے اور شعبوں میں پیش رفت کا ذکر بھی کر سکتے ہیں۔ ملک میں اس وقت سے بہت تبدیلیاں آ چکی ہیں۔ کینیڈا میں بھی۔ یہ سب کچھ محض جادو کے نتیجے میں نہیں ہوا۔ یہ سماجی ہمدردی رکھنے والی کارپوریشنوں یا رحم دِل حکومت کی طرف سے کوئی تحفہ نہیں تھا۔ یہ وسیع پیمانے پر چلنے والی عوامی تحریکوں اور ان اقدامات کا نتیجہ تھا جو تبدیلی لا سکتے ہیں اور ماضی میں بھی ایسا ہو چکا ہے۔ ہم اب بہت ہی تہذیب یافتہ ہو چکے ہیں۔

لنڈا اسولومان ووڈ: بہت بہت شکریہ۔ ہمارے پاس بہت سے کارآمد سوالات موجود ہیں۔ ''مسٹر چومسکی، آپ کا کیا خیال ہے کہ کووڈ-19 کی وبا کے بعد کی دنیا ایک زیادہ مُثبت اقتصادی اور سماجی دنیا کر راہ ہموار کرے گی یا پھر تنزلی کی طرف سفر جاری رکھے گی؟''

نوم: سوال کرنے والے جو بھی ہے، اس کا انحصار آپ پر ہے۔ راستے وہی ہیں جو کہ 1930 کی دہائی کے شروع میں ہمارے سامنے تھے، یعنی فسطائیت کا راستہ یا پھر آزاد سماجی جمہوریت کا راستہ۔ ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو شعوری طور پر یہ کوشش کر رہے ہیں کہ نو آزاد معیشت کے تصور پر مبنی دنیا کا مزید سخت بناوٹ کے ساتھ تسلسل جاری رہے۔ اور آپ کی طرح کے ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو کسی اور سمت تبدیلی کی کوشش جاری رکھیں گے۔ ایسے لوگ جو، مثال کے طور پر، ایسے (نا قابل سماعت) لوگوں سے جا ملیں گے جنہوں نے موسمیاتی تبدیلی کی تحریک چلائی جس کا نتیجہ وہی نکلا جس کی ہم مسلسل کوشش کر رہے تھے کہ ''بلیک راک'' اپنی پالیسیوں کو اس طرح تبدیل کر کے رکھ دے کہ جے پی مورگن چیز زیر زمین ایندھن کے ذخائر کے حوالے سے سرمایہ کی فراہمی میں کمی کر دے۔ اب جو بھی دنیا اجاگر ہوتی ہے اس کا انحصار ان طاقتوں کے باہمی توازن پر ہوگا۔

لنڈا اسولومان ووڈ: بہت بہت شکریہ، یہ سوال میکسین کوف مین لاکوسٹا کی طرف سے ہے۔ میکسین کا سوال یہ ہے کہ آپ نے صاف توانائی کا ذکر کیا، تاہم ایک حالیہ دستاویزی فلم ''پلانٹ آف دا ہیومنز'' کا جائزہ لینے کے بعد، جس میں قائل کر لینے کی حد تک یہ دلیل دی گئی تھی کہ شمسی توانائی کے

تختوں اور ہوا سے چلنے والی چرخیوں کی قلیل مدتی تنصیبات کے لئے اور ان ٹیکنالوجیوں کے تسلسل کے لئے اضافی ذخائر محفوظ رکھنے کے لئے اس سے مساوی یا زیادہ مقدار میں ایندھن کے زیر زمین وسائل کی ضرورت ہوگی جو اس وقت کوئلے تیل اور گیس کے جلانے سے استعمال ہوتے ہیں۔ کیا ماحول کے لئے کام کرنے والی غیر سرکاری تنظیمیں (NGOs) ہماری غلط سمت میں رہنمائی کر رہی ہیں، آپ کا اس بارے میں کیا خیال ہے؟ میرے خیال میں سوال آلودگی سے پاک توانائی کا ہے... کیا یہ اسی طرح کا ہے... کیا ہمیں دھوکہ دیا جا رہا ہے کہ شمسی توانائی اور ہوا سے پیدا کردہ توانائی دراصل اس لئے پاک صاف ہے کیونکہ ایک ''پلانٹ آف ہیومنز" نامی دستاویزی فلم میں قائل کر لینے کی حد تک دلیل دی گئی ہے کہ یہ کوئلہ، تیل اور گیس جلانے کے مترادف ہے۔ میرا خیال ہے کہ میں نے نکتہ صحیح طرح سے سمجھ لیا ہے، میکسین۔ آپ شمسی توانائی اور ہوا سے پیدا ہونے والی توانائی کو ایندھن کے زیر زمین وسائل کے جلانے کے مترادف قرار دینے کے حوالے سے بات کر رہی ہیں۔ کیا ہماری غلط رہنمائی کی گئی ہے؟

نوم: کسی طرح سے بھی قائل کر لینے کی حد تک دلیل نہیں دے سکتا کیونکہ اس کا حقیقت سے دور دور تک بھی تعلق نہیں ہے۔ میرا مطلب ہے کہ بے شک شمسی توانائی پر مصارف آتے ہیں۔ آپ نے ان تنصیبات کو ٹھکانے بھی لگانا ہوتا ہے، تو اس لئے آپ کو تیار بھی کرنا ہوتا ہے۔ مگر اس کا دور دور تک بھی زیر زمین ایندھن سے کوئی تعلق نہیں ہے اور یہ سوال کرنے والے سے بس یہی تقاضا کرنا ہے کہ معاملے پر مزید تفصیل سے غور کیا جائے۔

لنڈا اسولومان ووڈ: بظاہر، بل میکیبن نے ایک مضمون لکھ کر اس کی حقیقت عیاں کر دی تھی، تو میرے خیال میں سوال کرنے والے کو اس سے رجوع کرنا چاہیے۔

نوم، جس نے کہ اس حوالے سے کافی تحریریں لکھی ہیں کہ ایک پائیدار و مستحکم معیشت کیسی لگے گی، یہ بتائیں کہ آیا اس طرح کی معیشت ممکن بھی ہے؟

نوم: اس حوالے سے بہت سا دلچسپ کام کیا گیا ہے۔ رابرٹ پولن نے، جو کہ ایک بہت ہی زبردست معیشت دان اور میری تصنیفات میں شریک مُصنف رہا ہے، بہت تفصیل سے اظہار

www.MashalBooks.org

خیال کیا ہے کہ ایک ایسی پائیدار معیشت کیسے قائم کی جاسکتی ہے جو اس امر کو بھی یقینی بنائے کہ زیر زمین ایندھن کے وسائل سے وابستہ صنعت کے معدوم ہونے کے ساتھ ہی جو لوگ ملازمتوں سے محروم رہ جائیں گے دراصل ایک نئی معیشت میں بڑی کامیابی سے جگہ بنانے کی راہیں دریافت کر لیں گے، اور یہ بھی کہ یہ بہت ہی زیادہ حیات بخش معیشت ہوگی۔ یہ کوئی پر لطف صورتحال نہیں ہے کہ آپ ہفتے میں کئی گھنٹے ٹریفک جام میں پھنس کر بیٹھے ہوئے گزار دیں۔ بجلی کے وحشتناک بلوں کی بجائے یہ صورتحال بہت زیادہ خوشگوار اور صحت بخش رہے گی کہ ٹرانسپورٹ کا ایک عمدہ قسم کا عوامی نظام رائج کر دیا جائے۔ ہمیں تقریباً کوئی خرچہ بھی نہیں کرنا پڑے گا، میری طرح۔ شمسی توانائی سے استفادہ کریں (نا قابل سماعت)۔ دنیا کو رہنے کے لئے بہت زیادہ خوشگوار بنانے اور زیر زمین ایندھن کے وسائل کے استعمال سے اسے تباہ نہ کرنے کے بہت سے طریقے ہیں۔ رابرٹ پولن نے، جو کہ یونیورسٹی آف میساچوسٹس میں معیشت دان ہے۔ اسی طرح ایک اور شخصیت جیفری ساچس کی ہے، جو کہ کولمبیا یونیورسٹی میں بہت اچھا معیشت دان ہے، اور ''ارتھ سائنسز انسٹیٹیوٹ'' بھی چلا رہا ہے، اس نے اس حوالے سے بہت کچھ لکھا ہے اور کوئی دو ماہ قبل جرنل امریکن پراسپکٹ میں اس کا طویل، محتاط قسم کا ایک مضمون بھی شائع ہو چکا ہے۔

لنڈا سولومان ووڈ: اگلا سوال سینیٹر روزا گالویز نے کیا ہے۔ اس کا سوال یہ ہے کہ وہ ایسی کونسی فیصلہ کُن آزمائشیں ہیں جن کا ہم بیش سرمایہ دارانہ نظام (Hyper Capitalism) کے حوالے سے اس طرح اطلاق کرنا ہے کہ ایک اہم تبدیلی کی ترغیب دی جاسکے، مثال کے طور پر گردشی معیشت کی طرف یا پھر افزائش میں کمی کی طرف۔ اور اس سوال کے بعد کی صورتحال کا بھی جائزہ لیا جا رہا تھا، اس لئے میرا آپ سے بھی اور انابیل وائٹ سے بھی یہی سوال ہے۔ دنیا کا کیا ہوگا اگر انسٹیٹیوٹ آف گلوبل فنانس بالکل ہی برباد ہوگیا تو؟

نوم: خوب، تو اس کی کوئی وجہ نظر نہیں آرہی۔ عالمی معیشت گلی سڑی حکومتی حکمتِ عملیوں کی بدولت برباد ہوسکتی ہے، مگر اس کا یقیناً کوئی سبب نہیں ہے۔ مطلب یہ کہ ہم اس سے بھی بدتر وبائی صورتحال کا شکار ہوتے رہے ہیں۔ مثال کے طور پر ''اسپینش فلو'' کو ہی دیکھ لیں جو کہ ایک صدی

قبل پھیلا تھا۔ یہ اس سے بھی بدتر وبا تھی اور بہت ہی غریب ملک میں آئی تھی اور کسی کو یہ بھی علم نہیں تھا کہ اسکی کس طرح سے روک تھام کی جائے۔ کیا سب کچھ غائب ہو گیا تھا؟ معیشتیں بحال ہو گئی تھیں۔ اس وقت کی صورتحال اتنی خراب تھی اور اب بہت بہتر حالت میں ہیں کہ اس (وبا) سے نمٹ سکیں۔ میرا نہیں خیال کہ آیا میں تین چیزوں کا ذکر کر سکتا ہوں مگر ایسی بہت سی تجویزیں ہیں جن پر عمل کر کے صورتحال کی روک تھام کی جاسکتی ہے فوری طور پر، نہ صرف درپیش بحران بلکہ اس کے اسباب کی بھی۔ آئیں ایک نظر دیکھتے ہیں، میں دو وجوہات کے پیشِ نظر امریکہ کی مثال دوں گا: ایک تو یہ کہ میں اس کا زیادہ علم رکھتا ہوں اور دوسری یہ کہ ایک اہم ترین ملک ہے۔ تو عین اس وقت ایک بڑے پیمانے پر تحریک پیدا کرنے والی مجوزہ ترمیم پیش کی جا رہی ہے، جس کے مطابق (نا قابلِ سماعت) دولت منداور بڑے کاروباری اداروں کی نگرانی نہ ہونے کے برابر ہوگی وغیرہ وغیرہ۔ کیا ایسا ہونا چاہیے (یا نہیں)؟ ہم ہوابازی کی صنعت کو ہی لیتے ہیں جو میرے خیال میں (نا قابل سماعت)۔ فرض کریں کہ ہمیں انہیں اس لئے بھی مُشکل سے نکالنے کا فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ انہوں نے گذشتہ برس اپنے آپ کو دولت مند بنانے کے لئے بہت کچھ خرچ کر دیا تھا اپنے حصص واپس خریدنے کے لئے بجائے اس کے کہ اپنی کاروباری مہارت بڑھاتے اور یہ بھی فرض کریں کہ ہم ایسا کرنے کا حتمی فیصلہ کر لیتے ہیں۔ تاہم ایسا چند شرائط کے ساتھ کیا جاسکتا ہے۔ مثال کے طور پر آپ حکومت سے کچھ پیسہ چاہتے ہیں تو آپ کو اس عزم کا اظہار کرنا ہوگا کہ آپ یہ پیسہ اپنے حِصص کی بازیابی پر صرف نہیں کریں گے اپنا پیسہ محصولات کی جنت میں سرمایہ کاری پر بھی نہیں لگائیں گے جس کی بدولت عوام کے اربوں ڈالر ضائع ہو کر رہ جاتے ہیں، کارکنوں کو انتظامی بورڈ میں شامل کریں گے، مگر ان کو جو تمام کارکنوں کے لئے ایک مناسب اجرت کو یقینی بنائیں گے، مسافروں کی ضروریات کو مقدم رکھیں گے سرمایہ کاروں اور انتظامی سربراہان کی ضروریات پر۔ ہم یہ ساری شرائط عائد کریں گے۔ اگر آپ ان پر پورا نہیں اترنا چاہتے تو پھر دفع ہو جاؤ۔ ہم صنعت کا انتظام اپنے ہاتھوں میں لے لیں گے، یا کچھ ایسا ہی کام کریں گے۔ کیا یہ خیالی پلاؤ قسم کی چیز ہے، حُسن اتفاق سے۔ نہیں، کم سے کم ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔ ریگن سے پہلے یہ سب کچھ قانون

تھا۔اس پر عملدرآمد ہوتا تھا۔ یہ کہنا کوئی خیالی پلاؤ بنانا نہیں ہے کہ ہمیں وہی قانون پھر سے رائج کر دینا چاہیے جیسا کہ یہ نوآزاد معیشت سے پہلے کے دور میں رائج تھا۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔کیا ہم اس سے آگے جا سکتے ہیں؟ یقیناً جا سکتے ہیں۔آئیں تھوڑی دیر کے لئے اس وبا کے مآخذ کے بارے میں سوچتے ہیں۔ ایسا آخر ہوا کیوں؟ آپ واپس 2003 کی طرف لوٹ جائیں جب سانس کی شدید تکلیف کی علامات پر مبنی وبا (SARS) کا دور تھا۔ساری دنیا کے سائنسدانوں کو معلوم تھا کہ کورونا وائرس نامی ایک اور وبا آنے والی ہے۔اب انہیں معلوم تھا کہ اس کے لئے کس طرح تیار رہنا ہے مگر ایسا نہ ہوا۔ کیوں؟ صرف علم ہی کافی نہیں ہوتا۔آپ کے پاس اداروں کی شکل میں ایک پورا کا پورا سلسلہ موجود ہونا چاہیے ،تو صورتحال کا ادراک کیسے کرنا چاہیے تھا؟ خوب، بہت سے دواساز ادارے ہیں، بہت سے وسائل ہیں۔ہم تحفظ پر مبنی ایسے اقدامات کر کے ان کی سیاست کے لئے سرمائے کا بندوبست کرتے ہیں، جیسے ایجاد کے ناقابلِ یقین قسم کے حقوق (Patent Protection) جنہیں کہ حقوق ملکیت دانش (Intellectual Property Rights) کہا جاتا ہے۔دوساز اداروں کو دولت مند بنانے کے لئے عظیم الشان تحفہ ،تو اب وہ اس دولت سے بہت زیادہ فراواں ہو رہے ہیں جو ہم نے انہیں دی ہے۔ان کے پاس وسائل کی فراوانی ہے۔کیا وہ اس کام کی ذمہ داری لے سکتے تھے؟ نہیں، کیونکہ وہ سرمایہ دارانہ نظام کا حِصّہ ہیں۔ جس کا اصول یہ ہے کہ آپ کو جو کام کرنا چاہیے وہ منڈی کے اشاروں کی پیروی ہے۔وگرنہ آپ کسی طرح کا منافع حاصل نہیں کر سکو گے۔آپ کسی تباہی کی روک تھام کر کے منافع نہیں کما سکتے۔ سرمایہ کاری کرنے کے ایک دو برس کے بعد آپ منافع کمانا شروع کر دیتے ہیں ،کوئی بھی شے فروخت کر کے۔تو سرمایہ دارانہ منطق کی رو سے وہ میدان سے باہر ہو جاتے ہیں۔اب دوسرا سوال سامنے آتا ہے۔حکومت مداخلت کیوں نہیں کرتی۔تو جب میں بچہ ہوتا تھا، جب آپ کی والدہ بچی ہوتی تھیں تو اس وقت دنیا میں پولیو کی دہشت ہوتی تھی۔ یہ حقیقی معنوں میں دہشت تھی مجھے یاد پڑتا ہے۔اس پر ایسے سرکاری پروگراموں کی بدولت قابو پایا گیا جن کا نتیجہ سالک ویکسین (Salk Vaccine) کی صورت میں برآمد ہوا، جس کے حقوق (ملکیت) محفوظ نہیں

تھے۔سالک (ناقابل سماعت) کو اسے عطیہ کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں تھی۔تو پھر اب ایسا کیوں نہیں ہوتا؟ یہ نوآزاد معیشت کا مرض ہے جو یہ کہتا ہے کہ حکومت کو مدد کرنے کی اجازت نہیں ہے۔رونالڈ ریگن کو یاد کریں۔''حکومت مسئلہ ہے نہ کہ حل''۔ یہ کارپوریشنیں ہی ہوتی ہیں جو حل ہوتی ہیں۔ بلاشُبہ حکومت اس وقت حل ہوتی ہے جب ان (کارپوریشنوں) کو کوئی مسئلہ پیش آجاتا ہے ،اور ہم انہیں مُشکل سے نکالتے اور رعایتیں فراہم کرتے ہیں۔ ہاں اگر عام لوگ مصیبت میں ہیں تو حکومت کے پاس کوئی حل نہیں ہے۔ یہ ہے ہتھوڑے کا دوسرا جزو۔ان میں سے کوئی بھی ضروری نہیں ہے۔ان سب کا آسانی سے خاتمہ کیا جا سکتا ہے۔اقدامات کے حوالے سے سوچا جائے تو ہم آگے بڑھ سکتے ہیں۔ہم ان تنظیمی ڈھانچوں کو بدل سکتے ہیں جو ہمیں تباہی کی سمت لے جا رہی ہیں۔ یہ سب کچھ ہماری دسترس میں ہے۔

لنڈا سولومان ووڈ: نوم، یہ بہت زبردست مشاہدہ ہے مجھے یقین نہیں آ رہا مگر کیا ہم پہلے سے ہی اس لمحے کے اختتام تک پہنچ چکے ہیں جو ابھی قریب سے گزرا ہے۔آپ نے جو کچھ کہنا ہے، آپ جو کچھ سوچ رہے ہیں وہ سب خوشگوار حیرت کا حامل ہے اور میں آپ کے وقت اور آپ کی مہارت کے لئے آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں۔اور میں ان سب لوگوں کی بھی شکر گزار ہوں جو آج رات تشریف لائے۔اور اگر آج آپ یہاں مغرب میں نکلے ہوئے ہیں تو دعا ہے کہ محفوظ رہیں اور صحت مند رہیں۔اگلی ملاقات تک کے لئے خدا حافظ۔

نوم: آپ کے ساتھ بہت اچھا وقت گذرا۔

لنڈا سولومان ووڈ: شکریہ۔

ماخذ:

https://www.youtube.com/watch?v=zi6ae6kZNqE

اور مثال کے طور پر

https://cortescurrents.ca/what-kind-of-world-do-we-want-to-live-in/

www.MashalBooks.org